قیمت: -/15 روپے

جون 2006

ماہنامہ

اردو دنیا نئی دہلی

نوشاد علی

ولادت: 25 دسمبر 1919 وفات: 5 مئی 2006

قومی اردو کونسل کی جانب سے سوا لمبن (نورد اسکیم) کے تحت کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے زیر اہتمام چلائے جارہے کمپیوٹر سینٹر کی فارغ طالبات کے لیے جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا جس میں مہمانان خصوصی کے طور پر جناب ایس موہن (ڈائرکٹر انچارج قومی اردو کونسل) ڈاکٹر آر. کے. بھٹ (پرنسپل پبلی کیشن آفیسر قومی اردو کونسل) شریک ہوئے اور صدارت کل ہند اردو تعلیمی کمیٹی کے صدر جناب جلیل پاشا نے کی۔
اس موقعے پر جناب ایس موہن ایک طالبہ کو سند پیش کرتے ہوئے۔

قومی اردو کونسل کی جانب سے ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد کے اشتراک سے چلائے جارہے کیلی گرافی اینڈ گرافک ڈیزائن ٹریننگ سینٹر میں چھٹا بین الاقوامی مقابلہ خطاطی منعقد ہوا۔ اس موقعے پر لی گئی تصویر میں (دائیں سے) پروفیسر اشرف رفیع، پروفیسر مغنی تبسم، پروفیسر شاہد مہدی، پروفیسر افضل محمد، پروفیسر ضیاء الدین احمد شکیب، جناب محمد عبدالغفار اور طالبات۔

ماہنامہ
اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔8، شمارہ۔6 جون 2006

مدیر: ڈاکٹر آر۔ کے۔ بھٹ

معاون مدیر: ڈاکٹر فیروز عالم

ناشر اور طابع:
پرنسپل پبلی کیشن آفیسر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: اسد نیاز، بہلول احمد
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103938، 26103381
26179657 فیکس: 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26169416، 26109746

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات 2
ہماری بات 5

رو برو
● غلام علی سے گفتگو .... گورو ٹھاکر 6
● جان میکنس سے گفتگو .... مکند پدمنابھن 7

زبان اور تعلیم
● اردو میں مستعمل عربی مرکبات کیسے پڑھیں؟ .... فرید احمد برکاتی 10
● خواتین اور کمپیوٹر ٹیکنالوجی .... رباب قیصر 13
● 2005 کی اہم پاکستانی مطبوعات .... اسد فیض 17

سائنس اور طب
● سمندری طوفان: نوعیت اور اسباب .... اقبال محی الدین 21
● قبض — اسباب اور علاج .... حکیم اشہر قدیر 24

تاریخ
● چین کا حملہ .... مدن گوپال 26

شخصیات
● ہنری برگساں .... سید اقبال امروہوی 30

خراج عقیدت
● نوشاد علی — ایک عظیم موسیقار .... سید امتیاز الدین 36
● نوشاد — اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے .... سرور یوسف 38
● تاثرات .... فیروز عالم 40

ادب
● کرائے کی کُٹم .... انجم مانپوری 42

ہماری مطبوعات سے
● نصوح اور بچھلے بیٹے علیم کی گفتگو (''توبۃ النصوح'' سے ماخوذ) .... ڈپٹی نذیر احمد 48
● نیتا جی سبھاش چندر بوس کا خطبۂ صدارت (''خطبات آزادی'' سے ماخوذ) 53

طلبہ کے لیے
● ویٹرنری سائنس میں کیریئر .... راکیش کمار جھا 55
● لیفٹ اور سی .... پنیت نیر، استوتی نریمان 57

اُردو خبر نامہ .... ادارہ 60
تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 72

بچوں کا گوشہ
● ترکی ٹوپی (''بچوں کی کہانیاں'' سے ماخوذ) .... بی۔ پی۔ گپتا 79

آپ کی بات

■ غزال نگار، کاشانۂ شفیق، سلار نا ڈونگر، سوائی مادھوپور، راجستھان 322023

"اردو دنیا" کا تازہ شمارہ مئی 2006 باصرہ نواز ہوا۔ "ہماری بات" کے تحت آپ نے قومی اردو کونسل اور ریاستی اردو اکادمیوں کے ایک مشترکہ اور منظم منصوبے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ بلاشبہ ہماری ریاستی اردو اکادمیوں کی صورت حال ناگفتہ بہ ہے اگر وقت رہتے انھیں فعال نہیں بنایا گیا تو وہ دن دور نہیں کہ یہ اردو اکادمیاں ملک کے دیگر مردہ اداروں میں شمار کی جانے لگیں گی اور ریاستی ارباب اختیار ان مردہ اداروں کو اپنے دفتری کاغذوں میں ہی محفوظ رکھ کر اپنی پیٹھ تھپتھپاتے رہیں گے۔ اس کی ایک حالیہ مثال راجستھان اردو اکادمی ہے، جسے موجودہ حکومت نے برسر اقتدار آنے کے بعد تحلیل کرنا تو اپنا اولین فرض تصور کیا لیکن ہنوز اس کی تشکیل نو کے لیے وہ کسی خاص مہورت کا انتظار کر رہی ہے۔ علاوہ ازیں صاحبان اردو کی بے حسی بھی اس عمل میں یکساں ذمے دار ہے۔

"رو برو" کے تحت اسد فیض کی مشہور و معروف افسانہ نگار مشتاق یاد سے کی گئی گفتگو اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے ایک سیر حاصل مقالے سے کم نہیں۔ اس گفتگو کے مطالعے سے فن افسانہ نگاری کے تاریخی اور ارتقائی سفر کے ساتھ ساتھ فنی لوازمات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

زبان اور تعلیم کے حوالے سے پی. عبدالغفار اور عزل حسین قاسمی کے مضامین معلومات افزا ہیں۔ علاوہ ازیں سائنس اور ماحولیات پر رؤف ظفر اور عبید الرحمٰن کے مضامین سائنسی نقطۂ نظر سے معیاری ہیں۔ اروند گرٹو کا مضمون — "تھامس پین" متعلقہ شخصیت سے کلی طور پر متعارف کراتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تھامس پین امریکہ میں جمہوریت کے مستقبل شناس تھے۔ اس مضمون کا اردو ترجمہ ڈاکٹر رئیس احمد نے خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ رضوان احمد نے "ہندوستانی میڈیا کا بدلتا چہرہ" کے عنوان سے عہد حاضر کی صحافت پر روشنی ڈالی ہے جو معلومات میں اضافہ کرتی ہے۔

گوشۂ ادب میں نشتر خانقاہی کی شخصیت اور شاعرانہ عظمت پر جاوید ندیم کا مفصل و مدلل مقالہ انھیں ایک بہترین خراج عقیدت پیش کرتا ہے "خط و کتابت یا ای۔میل" فیروز ہاشمی کا عہد حاضر کے تناظر میں ایک دلچسپ اور معلوماتی مضمون ہے۔ "منزل قریب ہے (باپ کا خط بیٹے کے نام)" میں رضوان رضوی نے ناموافق حالات میں بھی کوشاں رہنے اور مسلسل جد و جہد کرتے رہنے کے ساتھ ساتھ منزل مقصود کی جانب گامزن رہنے کی تلقین کی ہے۔

■ رضوان خاں، سکریٹری، بزم اردو، شیخ سرائے سیتاپور۔ (یو. پی.)

مئی 2006 کا "اردو دنیا" نظر نواز ہوا۔ اداریے میں جہاں قومی اردو کونسل کی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے وہیں آپ نے یہ بات بھی بجا تحریر کی ہے کہ اکیسویں صدی میں اردو زبان و ادب اور تعلیم کی خاطر خواہ ترویج و ترقی کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ کونسل اور ریاستی اردو اکادمیاں ایک مشترکہ پلیٹ فارم سے کام کریں۔ ان منصوبوں پر عمل در آمد کے لیے ضروری ہے کہ ریاستی اردو اکادمیوں کی رابطہ کمیٹی تشکیل دی جائے جو تمام اکادمیوں سے مسلسل تال میل رکھے اور کونسل کو بھی اپنی سرگرمیوں سے باخبر رکھے تاکہ ملک میں اردو کے ہمہ جہت فروغ کو ممکن بنایا جا سکے۔

اس شمارے میں "منزل قریب ہے" (باپ کا خط بیٹے کے نام) اور "ختم ہوتے آبی ذخائر" خاصے اہم مضامین ہیں۔ اس کے علاوہ "کیرالا میں اردو تعلیم" کے حوالے سے مضمون شائع کر کے آپ نے قارئین کے لیے اچھی معلومات فراہم کی ہیں۔

اپریل 2006 کے "اردو دنیا" میں ممتاز محقق رشید حسن خاں مرحوم کی حیات و خدمات کے حوالے سے اداریہ اور "گوشۂ رشید حسن خاں" شائع کر کے آپ نے لائق مبارکباد کام کیا ہے۔ رشید حسن خاں نے اردو املا، اردو کیسے لکھیں، عبارت کیسے لکھیں، زبان و قواعد، انشا اور تلفظ اور ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ جیسی کتابیں لکھ کر نئے لکھنے والوں کی رہنمائی فرمائی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دیگر کتابیں بھی نہ صرف یہ کہ طلبہ کے لیے مفید ہیں بلکہ اساتذہ کے لیے بھی بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔

اردو خبر نامہ میں مرکزی حکومت سے اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے مطالبات پڑھے۔ یہ تنظیم لائق مبارکباد ہے کہ اس کے اراکین ملک اور بالخصوص اتر پردیش میں اردو کو اس کا حق دلانے کے لیے مثبت اقدامات کر رہے ہیں۔ اتر پردیش میں آج جب کہ درجہ 8 تک کے تمام سرکاری اسکولوں میں دیگر تمام مضامین کی کتابیں مفت تقسیم ہوتی ہیں وہیں اردو کی کتابیں بازار میں پیسہ دے کر بھی نہیں مل پا رہی ہیں۔ امتحانات میں اردو کے پرچے تک فراہم نہیں کرائے جا رہے ہیں۔ اردو اساتذہ و طلبہ کو دقتوں کا سامنا ہے۔ کیا حکومت اس جانب توجہ دے گی؟

■ سید امتیاز الدین، 805-5-3، حیدر گوڑا، حیدرآباد۔ 500029

ابھی ابھی ماہ مئی کا اردو دنیا ملا۔ ماشاء اللہ اس کے معیار اور تنوع میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ گوشۂ نشتر خانقاہی پسند آیا۔ زبان اور تعلیم کے تحت

پی.عبد الغفار کا مضمون ''کیرالا میں اردو تعلیم''، رؤف ظفر کا ''ختم ہوتے آبی ذخائر'' خامے کی چیزیں ہیں۔ مدن گوپال ہمارے بزرگوں میں ہیں۔ جواہر لعل نہرو کے سفر یورپ کے تذکرے سے نہرو جی کی شخصیت اور فکر کے بعض اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے فانی کی غزلیں دے کر آپ نے اس اہم شاعر کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس سلسلے کو جاری رکھیے۔ مصحفی کا کلام بھی اس گوشے میں آسکتا ہے۔

■ **سلیم خاں، ملا نگر، فیض پور، ضلع جلگاؤں، مہاراشٹر۔425503**

مئی کے شمارے میں آپ کا اداریہ اردو کے روشن مستقبل کا آئینہ دار ہے۔ ''منزل قریب ہے'' (باپ کا خط بیٹے کے نام) بے روزگار نوجوانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔ ''خط و کتابت یا ای میل'' مفید اور معلوماتی مضمون ہے، اس نوعیت کے مضامین وقت کی اہم ضرورت ہیں۔ مشایاد نے افسانے کی تعریف اور تخلیق کے متعلق بڑا ہی اچھوتا اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی گفتگو جامع اور دلچسپ ہے۔ کاش ان کا کوئی شاہکار افسانہ بھی شاملِ اشاعت ہوتا۔ ریاستوں میں اردو تعلیم کی صورت حال پر مضامین کا سلسلہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

■ **شاغل ادیب، 4/304/8/8- زیب منزل، مشیر آباد، حیدرآباد۔48**

''روبرو'' میں جناب اسد فیض نے مشایاد سے جو سوالات پوچھے ہیں وہ واقعی قابل تحسین ہیں۔ اور مشایاد نے ان کے جو جوابات دیئے ہیں وہ بھی مدلل ہی نہیں بلکہ افسانہ نگاری کے فن، ان کے موضوعات اور لوازمات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ''زبان و تعلیم'' کے تحت ''کیرالا میں اردو تعلیم'' بے حد پسند آیا۔ کیرالا میں اردو تعلیم کا ارتقا آج کے اردو کش دور میں واقعی قابلِ قدر ہے۔ کیرالا میں اردو تعلیم مذہب و فرقہ کی تفریق سے کوسوں دور ہے۔ ''تاریخ'' میں پنڈت نہرو پر مضمون بھی خوب ہے۔ زیرِ نظر شمارے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ نشتر خانقاہی کے خاکے کے ساتھ ان کا کلام بھی شامل ہے اور اس کے فوراً بعد شاعر یاسیات فانی بدایونی کی غزلیں بھی خوب ہیں۔ ''اردو دنیا'' میں عام طور پر شاعری کم ہی چھپتی ہے مگر اب کی بار اس میں جو اضافہ ہے وہ قارئین ''اردو دنیا'' کے لیے ایک سوغات کی حیثیت رکھتا ہے۔ باقی تمام مشمولات بھی اچھے ہیں۔ اردو دنیا اپنی صحافتی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں جدت طرازیاں بھی کر رہا ہے۔

■ **پرویز اشرفی، مرکزی درسگاہ اسلامی، سو محلہ روڈ، رامپور۔(یو.پی.)**

ماہنامہ ''اردو دنیا'' مئی کا شمارہ ادارۂ الحسنات، رامپور میں نظر نواز ہوا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا یہ جریدہ بے حد معیاری ہے۔ اس کا ہر کالم اہم اور وقت کی ضرورت ہے گوشۂ ادب ہو یا تاریخ، طلبہ کے کالم میں جناب رضوان رضوی کا ''منزل قریب ہے،'' ''باپ کا خط بیٹے کے نام'' بہت پسند آیا۔ خدا کرے ہمارے اردو قارئین اس کا مطالعہ کریں اور اس سے استفادہ کریں، اس کے لیے مضمون نگار کو مبارکباد۔

■ **سردار راز، 1220 اڈرین رن ڈرائیو، 116 کروٹلن ٹیکساس۔75010 (یو.ایس.اے.)**

اردو دنیا کے دو شمارے (فروری، اپریل) موصول ہو چکے ہیں۔ اردو کی موجودہ حالت کے پیش نظر آپ کی کوشش لائق صد تحسین ہے۔ دعا ہے کہ آپ اور دوسرے دردمندان اردو اسی طرح اپنی زبان کا حق ادا کرتے رہیں۔ یہاں اردو پر جو کام ہو رہا ہے وہ بیشتر کمپیوٹر انٹرنیٹ سے وابستہ ہے۔ چند دانش گاہوں میں اردو کے شعبے ہیں، ان کے کتب خانوں میں اردو کی کتابیں بھی ہیں۔ گاہے گاہے ایک آدھ اردو رسالہ بھی منظر عام پر آتا ہے اور پھر اہل اردو کی ادبی بے حسی کا شکار ہو کر اپنے فطری انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ مختلف شہروں میں اردو انجمنیں قائم ہیں اور بعض جگہ تو ایک سے زیادہ بھی ہیں لیکن ان کی سرگرمیاں بیشتر صرف مشاعرہ منعقد کرنے تک ہی محدود ہیں۔ اردو کی بقا اور فروغ کے لیے مقامی سطح پر کوئی کام نہیں ہو رہا ہے۔ اور یہ افسوس کا مقام ہے۔

■ **ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، سی. 501 سوز دوڈ اپارٹمنٹ، میورو ہار، نئی دہلی۔110091**

اردو دنیا کا اپریل 2006 کا شمارہ موصول ہوا۔ گوشۂ رشید حسن خاں بہت زیادہ پسند آیا۔ اور اس گوشے کے مضامین سے بہت زیادہ مستفید ہوا اور اس لاثانی محقق کی امتیازی خصوصیتوں اور علی الخصوص ان کی عدیم النظیر قابلیت اور تبحر علمی کا اندازہ ہوا خود مرحوم کے دونوں مضامین بہت زیادہ پسند آئے۔

یہ گوشہ شائع کر کے آپ نے بہت بڑا کام کیا ہے مبارکباد قبول فرمائیں۔

■ **محمد یعقوب الرحمٰن، شندے نگر، ایوت محل۔445001**

رشید حسن خاں صاحب سے برسوں خط و کتابت رہی اس لیے ان کا انتقال میرے لیے کسی اپنے کے بچھڑنے کے برابر ہے۔ خاں صاحب کے انتقال کے بعد رفعت سروش صاحب کا مضمون ''اردو بک ریویو'' نئی دہلی میں دیکھنے کو ملا۔ اس کے بعد وہی مضمون ''کتاب نما'' نئی دہلی اور روزنامہ ''انقلاب'' ممبئی میں پڑھنے کو ملا۔ ایک مضمون مختلف رسائل میں دیکھنے کے بعد رشید حسن خاں صاحب کی جدائی کچھ زیادہ محسوس ہوئی۔ اتنا بڑا آدمی چلا جائے اور لکھنے والوں کے قلم کو جنبش نہ ہو۔ اس بے حسی پر افسوس کی کیفیت سے گزر رہا تھا کہ ''اردو دنیا'' کا تازہ شمارہ ملا۔ رشید حسن خاں صاحب کی شخصیت و خدمات پر نو مضامین اور خاں صاحب مرحوم کے دو مضامین کی وجہ سے زیرِ نظر شمارے کو خصوصی شمارہ کہا جا سکتا ہے جس کے لیے آپ اور آپ کا عملہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مہاراشٹر کی نصابی کتب میں ان کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں تضاد دیکھ کر صحیح سالِ ولادت جاننے کے لیے ان سے رابطہ قائم کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں ''.....جی ہاں، تاریخ ولادت کی دورنگی میرے ساتھ بھی ویسی ہی ہے جیسی بہت سے لوگوں کے ساتھ ہوئی ہے۔ تعلیمی کاغذوں میں 10 جنوری 1930 درج ہے۔ ظاہر ہے یہ دوسروں کی درج کرائی ہوئی ہے۔ جب ایک بار تاریخ کاغذ میں آگئی تو اب دوسرے کاغذ میں بھی وہی آتی رہے گی۔ خاص کر ملازمت کے کاغذوں میں۔ صحیح سالِ ولادت 1925 ہے۔ میں نے کئی بار زبانی گفتگو میں اور ایک مضمون میں اس کی وضاحت کردی ہے۔''

مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں سالِ ولادت تو 1925 طے ہے لیکن تاریخ پیدائش کے تعلق سے یقین کے ساتھ کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ رشید حسن خاں صاحب کے رشتہ دار یا پھر کوئی عقیدت مند اس تعلق سے تحقیق کرے تو یہ کوئی مشکل کام نہ ہوگا۔ احتیاطاً رشید حسن خاں صاحب مرحوم کے خط کی زیراکس کاپی منسلک ہے۔

رشید حسن خاں کے خط کی فوٹو کاپی ہمیں موصول ہو گئی ہے جس میں خاں صاحب نے اپنے قلم سے اپنا سالِ ولادت 1925 لکھا ہے۔ (ادارہ)

■ **عبیدالرحمٰن، ایم۔2، ریگل بلڈنگ، گلی نمبر 6، ذاکر نگر، نئی دہلی۔25**

اپریل 2006 کے شمارے میں رشید حسن خاں کا گوشہ شامل ہے۔ اس لحاظ سے یہ شمارہ دستاویزی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ خاں صاحب کی اپنی تحریر بھی موجود ہے جس سے اس گوشے کا معیار مزید بلند ہوا ہے۔ آپ کی کوشش قابلِ تعریف ہے۔

پہلے خط کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ کچھ لوگوں نے اردو کو اس سائنس اور اطلاعاتی ٹکنالوجی کے دور میں بھی mainstream سے دور رکھنا ہی مناسب سمجھا ہے۔ ایسے لوگ اردو کے دامن کو وسعت بخشنے کے بجائے اسے تنگ کر رہے ہیں۔ حالاں کہ اس حوالے سے آپ جو مضامین شاملِ اشاعت فرماتے ہیں ان سے ایک بڑا حلقہ مستفیض ہو رہا ہے۔

■ **محمد ابراہیم صدیقی، حسن منزل، الگنیہ، الہ آباد۔3**

اپریل کے شمارے میں رشید حسن خاں پر گوشہ شائع کر کے دوسرے ادبی جرائد پر آپ سبقت لے گئے ہیں۔ اس رسالے کے جملہ مشمولات معیاری ہوتے ہیں لیکن آپ کی بات، ہماری بات، اردو ادب کوئز، خبرنامہ، بچوں کا صفحہ اور تبصرہ و تعارف بطورِ خاص معلومات افزا ہوتے ہیں۔

■ **شائستہ افشاں، حکیم چک، رفیع گنج، اورنگ آباد۔ (بہار)**

''اردو دنیا'' مارچ 2006 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ میں اس شمارے کے بعض مشمولات سے خاص طور پر متاثر ہوئی جن میں ''عہد طفلی اور ذہنی آزادی'' (ساجدہ زیدی) ''کم ہوتی بیٹیاں'' (ناصر الدین) اور گوشۂ ادب کے تحت ''میر کلو کی گواہی'' (انجم مانپوری) ''حکم میرے آقا'' ''غالب کی دلی''، ''اقتدار کی منتقلی'' اور ہاشم قدوائی کا مضمون دلچسپ اور معلومات افزا ہیں۔

■ **اختر سندیلوی، 34 اے، فقیرا گنج، کٹرہ، الہ آباد۔211002**

ماہ مارچ کا اردو دنیا خوب ہے جن مضامین نے متاثر کیا ان میں جناب خواجہ احمد فاروقی کا ''غالب کی دلی'' بہت پسند آیا۔ مدن گوپال صاحب کا ''اقتدار کی منتقلی'' بھی اپنا اثر چھوڑے بغیر نہ رہ سکا۔ جناب ناصر الدین صاحب کا ''کم ہوتی بیٹیاں'' آنکھیں کھول دینے والا مضمون ہے لگتا ہے ہم پھر دورِ جہالت کی جانب گامزن ہیں۔ انجم مانپوری کے مزاحیہ افسانے ''میر کلو کی گواہی'' کو دو تین بار پڑھا، ہر بار ایک نیا لطف و انبساط محسوس ہوا۔ اس عمدہ پیش کش کے لیے مبارکباد قبول فرمائیں۔

■ **بختیار احمد 21، دورگاباڑی کالونی، گیا۔ (بہار) 823001**

ماہنامہ اردو دنیا کا شمارہ مارچ 2006 نظر نواز ہوا۔ اس کے مشمولات بے حد پسند آئے۔ ''غالب کی دلی'' خواجہ احمد فاروقی صاحب کی ایک بہترین پیش کش ہے جس میں انھوں نے دلی کے تاریخی اور ادبی احوال کا ذکر بڑے ہی فاضلانہ انداز میں کیا ہے۔ محترمہ ساجدہ زیدی نے ''عہد طفلی اور ذہنی آزادی'' کے زیرِ عنوان بچوں کی شخصیت اور اس کے گوناگوں پہلوؤں پر جس تکنیکی انداز میں تجزیہ پیش کیا وہ سبھی والدین کے لیے نصیحت آموز ہونے کے ساتھ ساتھ عمل پیرا ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ ''روبرو'' کے تحت محترم فیروز عالم کی بیدار بخت سے کی گئی گفتگو معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ انجم مانپوری کا طنزیہ و مزاحیہ افسانہ ''میر کلو کی گواہی'' ایک بہترین شاہکار ہے۔ ''حکم میرے آقا'' بھی ایک اچھا مضمون ہے جو روبوٹ سے متعلق جملہ معلومات فراہم کرتا ہے، اس مضمون کا اردو ترجمہ اظہار احمد ندیم نے بہت ہی خوبصورتی سے کیا ہے۔ علاوہ ازیں ''کم ہوتی بیٹیاں'' بھی ایک اہم مضمون ہے جو قاری کو غور و فکر پر مجبور کرتا ہے اس مضمون کا ترجمہ خان شاہد وہاب نے بڑی باریکی سے کیا ہے۔ ان دونوں مترجمین کو راقم السطور کی جانب سے مبارکباد۔

■ **اظہار خضر، سٹی کورٹ، پٹنہ۔7 (بہار)**

رشید حسن خاں (مرحوم) پر بروقت گوشہ نکال کر آپ نے ایک بڑا کام کیا۔ ایک قلمکار کو خراج عقیدت پیش کرنے کی اس سے بہتر اور کوئی صورت نہیں ہوسکتی۔ خاں صاحب زبان کے مزاج داں اور اردو ادبی تحقیق کے صفِ اول کے قلمکار تھے۔ ان کی تحریروں نے اردو کے قلمکاروں کی پوری ایک نسل کی ذہنی اور علمی تربیت کی ہے۔ علاوہ ازیں اس شمارے کے دیگر مشمولات ''حسن انتخاب'' کی عمدہ مثالیں پیش کرتے ہیں۔ سکندر احمد سے کی گئی اسد ثنائی کی گفتگو نے بھی متاثر کیا ہے۔

□□□

ہماری بات

موسیقار نوشاد علی کا پانچ مئی کی صبح سوا نو بجے انتقال ہو گیا۔ رتن، شاہ جہاں، انمول گھڑی، بیجو باورا، میلہ، آن، شباب، دیدار، اڑن کھٹولہ، مدر انڈیا، مغل اعظم، پاکیزہ اور دل دیا درد لیا جیسی فلموں کی شاندار کامیابی میں نوشاد صاحب کی موسیقی نے نمایاں کردار ادا کیا۔ نوشاد، شکیل بدایونی اور محمد رفیع کی سنگت نے تقریباً تین دہائیوں تک سامعین کو اپنے سحر سے مسحور کیا۔ ان تینوں فنکاروں نے ایک ایسے دور میں دلوں میں اتر جانے والے گیت اور بھجن پیش کیے جو تقسیم ملک کے ناگوار اثرات کی گرفت میں تھا۔ انھوں نے ثابت کر دیا کہ موسیقی اور شاعری تنگ نظرانہ سیاست سے بالاتر ہے۔ 11 سال کی عمر میں 1937 میں لکھنؤ سے بھاگ کر ممبئی جانے والے نوشاد نے 66 فلموں میں موسیقی دی جن میں سے 26 نے سلور جبلی، 9 نے گولڈن جبلی اور تین نے ڈائمنڈ جبلی منائی۔ ممبئی کی فلم نگری میں ایسی زبردست کامیابی کسی اور موسیقار کو نصیب نہ ہو سکی۔

1953 میں ریلیز ہونے والی فلم ''بیجو باورا'' کے لیے انھیں بہترین موسیقار کا اعزاز ملا۔ ممبئی کے براڈوے تھیٹر میں اس کے پریمیئر کے موقعے پر نوشاد کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ پروڈیوسر وجے بھٹ نے جب اس کی وجہ دریافت کی تو نوشاد صاحب نے جواب دیا کہ جب میں تھیٹر کے سامنے والی سڑک کے اس پارفٹ پاتھ پر سوتا تھا تو اس سنیما ہال میں اپنی موسیقی والی فلمیں دکھائے جانے کے خواب دیکھتا تھا۔ فٹ پاتھ کو پار کر کے یہاں تک آنے میں مجھے 16 سال کا طویل عرصہ لگ گیا۔

کہتے ہیں کہ انسان میں ہمت اور حوصلہ ہو تو کامیابی اس کے قدم چومتی ہے۔ نوشاد اس کی بہترین مثال تھے۔ موسیقی سے انھیں جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تمام خاندانی بندشوں اور اس راہ میں پیش آنے والی تکالیف کے باوجود انھوں نے دوسرا راستہ اختیار نہیں کیا۔ سازوں کی ایک دکان پر صرف اس لیے نوکری کی کہ وہاں کچھ سازوں پر ریاض کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ انھوں نے ممبئی آ کر کافی عرصے تک موسیقاروں کے آرکسٹرا میں پیانو اور ہارمونیم بجا کر گزر بسر کی۔ موسیقار وینا ناتھ مدھوک نے ان کی صلاحیت پہچانی اور فلم ''پریم نگر'' میں انھیں پہلی بار موسیقی دینے کا موقع ملا۔ اس کے بعد ''شاردا'' سے ان کی شناخت موسیقار کے طور پر قائم ہوئی۔ فلم ''رتن'' سے انھیں کافی شہرت ملی اور اس کے بعد انھوں نے پھر کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔

نوشاد کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ موسیقی دیتے وقت فلم کے مطالبات کو تو مدنظر رکھتے ہی تھے، گیت کے مزاج کو بھی ملحوظ رکھتے تھے۔ انھوں نے فلمی گیتوں میں ہندوستانی راگوں کے ساتھ لوک سُروں کو سمونے کی شروعات کی۔ ان کے اس تجربے نے جہاں سامعین کو اپنی جانب متوجہ کیا وہیں اس سے گیتوں کے مزاج کے مطابق سُروں کو ڈھالنے اور ایک ہی گیت میں کئی راگوں اور لوک سُروں کے استعمال میں کافی سہولت ہو گئی۔ انھوں نے تکنیک کی سطح پر بھی کئی بڑے اور انقلابی قدم اٹھائے مثلاً بانسری کے ساتھ کلیرینٹ اور ستار کے ساتھ مینڈولن بجانے کا تجربہ کیا۔ اس کے علاوہ گلوکار کی آواز اور موسیقی کو الگ الگ ریکارڈ کرنے اور پھر انھیں باہم آمیز کرنے کی شروعات بھی انھوں نے ہی کی۔ اب فلموں میں عام طور سے یہی طریقہ مستعمل ہے۔

نوشاد نے نہ صرف دھنوں میں نیا پن اور تازگی برقرار رکھنے کے لیے تجربے کیے بلکہ فلمی دنیا کو نئی آوازوں سے بھی واقف کرایا۔ محمد رفیع، لتا منگیشکر، ثریا، ٹن ٹن (اوما دیوی) اور مہیندر کپور کی آوازوں کو شناخت عطا کرنے میں ان کا اہم حصہ رہا۔ پہلے کلاسیکی گلوکار فلمی گیت گانے سے پرہیز کرتے تھے لیکن نوشاد نے امیر خاں، ڈی وی پلسکر اور بڑے غلام علی خاں صاحب جیسی ہندوستانی موسیقی کی عظیم ہستیوں سے گانے گوا کر کلاسیکی اور فلمی موسیقی کی حد فاصل کو مٹا دیا۔ وہ جہاں طبلہ، ہارمونیم اور ستار جیسے روایتی سازوں کے سہارے بہت سادے طریقے سے نغموں میں جان ڈال سکتے تھے وہیں گیت کی ضرورت کے مطابق 100 سازوں کے آرکسٹرا کا نظم بھی بخوبی سنبھال سکتے تھے۔ فلم ''آن'' میں ان کے اس ہنر کا کمال بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح فلم کی ضرورت کے مطابق وہ بآسانی مغربی موسیقی کی مدد بھی لے سکتے تھے۔ فلم ''جادو'' میں یہ تجربہ بے حد کامیاب رہا۔

نوشاد صاحب گیتوں اور اپنے سُروں کے ہر پہلو کا نہایت باریکی سے جائزہ لیتے تھے۔ آج کے موسیقاروں کی طرح وہ جلد باز نہیں تھے۔ وہ آخری لمحے تک بہتر سے بہتر نتیجہ پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی موسیقی میں شاید ہی کوئی کمزوری نظر آتی ہو۔ فلمی موسیقی میں گراں قدر خدمات کے لیے انھیں دادا صاحب پھالکے اعزاز کے علاوہ کئی دیگر اعزازات بھی پیش کیے گئے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ گذشتہ دنوں 47 سال بعد جو دو ہندوستانی فلمیں ''مغلِ اعظم'' اور ''تاج محل'' پاکستان میں ریلیز ہوئیں، اتفاق سے ان دونوں میں نوشاد کی موسیقی تھی۔ نوشاد صاحب خود بھی اس موقعے پر پاکستان جانا چاہتے تھے لیکن قدرت کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا۔

ہندوستانی فلمی موسیقی کی تاریخ میں نوشاد علی کا نام سنہرے حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ انھوں نے کلاسیکی موسیقی کو جس خوبی کے ساتھ فلمی دھنوں میں استعمال کیا اور مقبول عام بنایا یہ صرف انھی کا حصہ ہے۔ درجنوں فلمیں ان کے دل کو چھو لینے والے نغموں کی وجہ سے شاندار کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔ شاہ جہاں، درد، بابل، بیجو باورا، اڑن کھٹولہ، مدر انڈیا، مغل اعظم، گنگا جمنا اور رتن وغیرہ فلمیں اس ضمن میں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ آج نوشاد صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی موسیقی سے سجے نغمے ہمیشہ ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔

□□□

تحریر: گورو شاکر
ترجمہ: امتیاز عالم

غلام علی سے گفتگو

غلام علی کا شمار عصر حاضر کے صف اول کے غزل گائکوں میں ہوتا ہے۔ ان کی گائی ہوئی غزلیں نہ صرف برصغیر بلکہ جہاں بھی اردو کے شیدائی ہیں، سنی اور پسند کی جاتی ہیں۔ اردو کے بعض بڑے شاعروں کی شہرت میں غلام علی کی غزل گائکی کا اہم کردار ہے مثلاً احمد فراز کی اولین شہرت غلام علی مرہون منت ہے جو کی ابتدا کی غزل (محبتیں) ہی ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ" سے کوئی تقریباً تیس برس پہلے ہوئی۔ غلام علی کی گائی ہوئی غزل "چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے" جسے بی۔آر۔ چوپڑہ کی فلم "نکاح" میں شامل کیا گیا، آج بھی لوگوں کے ذہن میں تازہ ہے۔ غلام علی نے ایسی لاتعداد لازوال غزلیں گائی ہیں جن میں "دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی"، "ہم کو کس کے غم نے مارا"، ہنگامہ ہے کیوں برپا"، پتہ پتہ بوٹا"، "دل، یہ پاگل دل مرا"، "اپنی دھن میں رہتا ہوں"، "کل چودھویں کی رات تھی" اور "آج دل سے دعا کرے کوئی" وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ گذشتہ دنوں وہ ہندوستان تشریف لے آئے۔ اس موقع پر ان سے کی گئی گفتگو کے اہم اقتباسات قارئین "اردو دنیا" کی نذر ہیں۔

سوال: آپ 26 سال سے ہندوستان آ رہے ہیں۔ کیا آپ کو ملک میں کوئی تبدیلی محسوس ہوتی ہے؟

جواب: میرا خیال ہے کہ میں اب بھی سیکھ رہا ہوں۔ میں پوری دنیا میں گھوما ہوں لیکن ہندوستان کے لیے میرے دل میں ایک نرم گوشہ ہے۔ میری رائے میں ہندوستان میں بہت زیادہ تبدیلی نہیں آئی ہے۔

سوال: گزشتہ برسوں میں ہند و پاک رشتوں میں جو تبدیلی آئی ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

جواب: ہاں، دونوں ممالک کے رشتے خوشگوار ہوئے ہیں، اختلافات ختم ہو رہے ہیں۔ چہرے، خورد و نوش، زبان، عادتیں، مزاج اور ماحول ہر اعتبار سے دونوں ممالک میں تبدیلیوں کا انداز یکساں ہے۔ اب بس سُر ملنے چاہئیں۔

سوال: ہندوستان سے اتنی طویل وابستگی سے متعلق کوئی خصوصی واقعہ جو آپ کے لیے یادگار ہو؟

جواب: ایک بار میں پروگرام پیش کر رہا تھا، میں نے دیکھا کہ پنڈت بھیم سین جوشی سامعین کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ میرے جیسے نوآموز کو سننے کیوں چلے آئے۔ پنڈت جی نے مجھ سے کہا کہ میری بیوی سے پوچھیے کہ ان کا پسندیدہ فنکار کون ہے۔ نام جان کر مجھے بہت اچھا لگا اور اس سے بھی اچھا اس وقت لگا جب پنڈت جی نے اپنے ہاتھوں سے مجھے شال پیش کی اور مجھ پر اپنا پیار نچھاور کیا۔ اس سے زیادہ مجھے اور کیا چاہیے۔

سوال: جب آپ اسٹیج پر پروگرام پیش کر رہے ہوتے ہیں تو کن باتوں کا خیال رکھتے ہیں؟

جواب: میں سامعین کو مدنظر رکھتا ہوں۔ میں سامعین کے چہرے پڑھ لیتا ہوں اور ان کی پسند کے مطابق غزلیں گاتا ہوں۔ میں انھیں ایسی چیزیں نہیں سناتا جو وہ سمجھ ہی نہیں سکیں۔

سوال: آپ کے پروگراموں میں نوجوانوں کی شرکت کیسی رہتی ہے؟

جواب: میرے حالیہ پروگراموں میں زیادہ سے زیادہ نوجوانوں نے شرکت کی اور میری پذیرائی کی لیکن میرا خیال ہے کہ انھیں اپنے بزرگوں کے بنائے ہوئے اصولوں پر عمل کرنا چاہیے اور اپنی اعلیٰ قدروں کی پاسداری کرنی چاہیے۔

(بشکریہ "ٹائمس آف انڈیا" 3 مئی 2006)

□□□

تحریر: مکند پدمنابھن
ترجمہ: معین الدین خاں

جان میکنسن سے گفتگو

51 سالہ جان میکنسن (John Makinson) دنیا کے بڑے اشاعتی اداروں میں سے ایک پین گوئن گروپ (Penguin Group) کے چیئرمین اور چیف ایگزیکٹیو ہیں۔ وہ بین الاقوامی میڈیا کمپنی پیرسن کے بورڈ آف ڈائرکٹرس میں بھی شامل ہیں جس کی شاخیں پینگوئن، فنانشیل ٹائمس گروپ اور پیرسن ایجوکیشن ہیں۔

جناب میکنسن کی پیشہ ورانہ زندگی میں صحافت اور سرمایہ کاری کا باہم امتزاج نظر آتا ہے۔ کیمبرج میں تاریخ اور انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز رائٹرس (Reuters) میں ملازمت سے کیا۔ پھر1979 میں فنانشیل ٹائمس سے وابستہ ہوئے اور 1994 سے 1996 کے درمیان اس کے مینجنگ ڈائرکٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ مالیات کے شعبے میں ان کے کیرئیر ریکارڈ کو دیکھیں تو انہوں نے 'ساتچی اینڈ ساتچی' (Saatchi & Saatchi) کی امریکی ہولڈنگ کمپنی میں وائس چیرمین کی حیثیت سے کام کیا۔ 1996 سے 2002 کے دوران وہ پیرسن گروپ کے مالیاتی ڈائرکٹر رہے۔ وہ 2000سے پینگوئن گروپ کے چیئرمین اور 2002 سے اس کے چیئرمین کے ساتھ ساتھ چیف ایگزیکٹیو بھی ہیں۔

جناب میکنسن، جو حال ہی میں چنئی میں تھے، ان سے کی گئی گفتگو کے اہم اقتباسات روزنامہ "دی ہندو" کے شکریے کے ساتھ قارئین "اردو دنیا" کی نذر ہیں۔

سوال: گذشتہ چند دہائیوں میں بڑے اشاعتی اداروں، مثلاً پینگوئن، حصول کاری کے عمل کی وجہ سے پہلے سے بھی زیادہ بڑے ہو گئے ہیں۔ اس صورت حال میں چھوٹے ناشروں کا مستقبل کیا ہے؟

جواب: میرے خیال میں چھوٹے ناشروں کے لیے بھی گنجائش ہے۔ اس وقت برطانیہ میں چند ایک چھوٹے ناشر ہیں، جو بہت ہی کامیاب ہیں۔ پروفائل بکس(Profile Books)، حالانکہ ایک چھوٹا اشاعتی ادارہ ہے، لیکن اس نے برطانیہ میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں (Best Selling Titles) میں سے تین کتابیں شائع کی تھیں۔ اس کے علاوہ کینن گیٹ (Cannon Gate) اشاعتی کمپنی بھی بہت کامیاب رہی ہے لیکن یہ ایک بہت ہی جوکھم بھرا کاروبار ہے اور اس میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ مقبول عام ہونے والی کتابیں شائع کی جائیں۔ 'کینن گیٹ' نے 'لائف آف پائی' (Life of Pi) اور 'پروفائل' نے 'Eats, Shoots and Leaves' جیسی کتابیں شائع کیں۔ یہ دونوں کتابیں بین الاقوامی سطح پر سب سے زیادہ فروخت ہوئیں۔

اس طرح کی کتابوں کی اشاعت میں کامیابی کے باوجود مسئلہ یہ ہے کہ چھوٹے ناشروں کے لیے ایسی کتاب خریدنا مشکل ہو جاتا ہے کیوں کہ وہ پیشگی کی رقومات میں ہو رہے اضافے کو برداشت نہیں کر پاتے ہیں لہٰذا ایک چھوٹے ناشر کو اپنا وجود قائم رکھنا بہت مشکل ہے۔

سوال: لیکن کیا وہ اپنا وجود قائم رکھ پائیں گے؟

جواب: میں پر اُمید ہوں۔ حقیقت میں ہمیں ان کی ضرورت ہے۔ اشاعتی شعبے کو خطرہ اشاعتی کمپنیوں کے ایک دوسرے میں ضم ہونے سے نہیں ہے کیوں کہ اس میں انضمام اور علاحدگی لازم و ملزوم ہیں۔ خطرہ دراصل کتابوں کی تقسیم، خصوصاً ہائی اسٹریٹ خوردہ فروشی کے نظام میں کسی خاص ادارے یا کمپنی کے تسلط سے ہے۔ برطانیہ کی دو سب سے بڑی کتب فروش کمپنیوں واٹر اسٹونس(Water Stones) اور اٹا کرس(Otta Kars) کے درمیان انضمام کی تجویز زیر غور ہے۔ اگر یہ دونوں کتب فروش نیٹ ورک آپس میں مل گئے تو نئے اور ابھرتے ہوئے مصنفوں کی کتابیں شائع کرنے والے چھوٹے

ناشروں کی مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا کیوں کہ اگر آپ اس مشترک کمپنی یا نیٹ ورک سے وابستہ خریدار کو اپنی کتاب کو فروغ دینے کے لیے آمادہ نہیں کر پاتے ہیں تو آپ خسارے میں رہیں گے۔ لہٰذا یہ رجحان ادبی اشاعت کے لیے عام طور پر اور چھوٹے ناشروں کے لیے خاص طور پر ایک بڑا خطرہ ثابت ہو رہا ہے۔

سوال: گذشتہ سال پینگوئن نے 70 سال مکمل کر لیے اور آپ نے اس موقع پر بطور یادگار 70 مختصر کتابیں ایک سیریز کے تحت شائع کیں۔ کیا ان کتابوں نے اچھا کاروبار کیا یا ان کتابوں کو اس لیے شائع کیا گیا تھا کہ پینگوئن اور پیپر بیک کے بارے میں ایک بہتر تاثر قائم کیا جا سکے۔

جواب: دیکھیے، ان کتابوں کی بیس لاکھ سے زیادہ کاپیاں فروخت ہوئیں، اس لحاظ سے تو یہ بہت کامیاب رہیں لیکن ان کتابوں کی اصل قدر و قیمت ہمارے لیے یہ ہے کہ یہ پینگوئن اور پیپر بیک کے تجارتی مارکہ کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ اس سلسلے میں صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ "ہم پینگوئن ہیں اور ہم ایک اختراع پسند ناشر ہیں" بلکہ ہر ایک کو پینگوئن اور پیپر بیک کی میراث کی یاد دہانی مقصود تھی۔ پچھلے سال جو ہم نے کیا وہ بھی پینگوئن کتابوں کے ڈیزائن کے ورثے کی جانب ہر کسی کی توجہ مبذول کرانے کے مقصد سے تھا۔ وہ سبھی خوبصورت ڈیزائن والی کتابیں تھیں۔ ہم 70 ڈیزائنروں کے پاس گئے اور انھیں 70 دن کا وقت اور 70 پاؤنڈ دیا۔ حالانکہ ان کتابوں کے ڈیزائن کے لیے یہ کوئی بڑی رقم نہیں تھی۔ لیکن ہمیں کئی خوبصورت ڈیزائن حاصل ہو گئے۔ یہ سیریز مصنفین سے ہمارے تعلقات کے حق میں بھی نیک ثابت ہوئی۔ مجھ سے نہ جانے کتنے مصنفین آکر ملے، جن کی کتابیں، اس سیریز میں شائع ہوئی تھیں اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ "یہ ایک عظیم کارنامہ تھا اور ہم نے اسے کافی پسند کیا۔"

سوال: اس وقت پینگوئن کن اہم شعبوں میں سرگرم ہے؟

جواب: اس وقت جو ایک اہم معاملہ ہے، جو کہ ایک چیلنج بھی ہے، وہ یہ کہ ڈیجیٹل ٹکنالوجی کس طرح کتابوں کی تجارت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ کیا کتاب کو الیکٹرانک کتاب (e-book) کی شکل میں پسند کیا جائے گا؟ کیا ہمیں کتابوں کو فروخت کرنے کے ساتھ ساتھ کرائے پر بھی دستیاب کرانا چاہیے، کیا ہمیں خریداروں کو انٹرنیٹ پر کتابیں فراہم کرنا چاہیے۔ یہ سب کلیدی سوالات ہیں، جن سے ہم نبرد آزما ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس میں خطرے کا بھی امکان ہے لیکن اس کے ساتھ یہ ایک بہت بڑا موقع بھی ہے۔

کتابوں کی اشاعت اور تجارت میں اضافے کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کتابی صنعت میں ترقی ہوئی ہے لہٰذا اگر آپ کتابوں کی نکاسی کے لیے نئے مواقع پیدا کرتے ہیں، خواہ یہ ایک سوپر مارکٹ میں ہو یا انٹرنیٹ پر ہو۔ تو اس سے مانگ میں اضافہ یقیناً ہوگا۔

ڈیجیٹل دنیا یقیناً اس اضافی فراہمی کے مواقع پیدا کرنے جا رہی ہے۔ ہمیں کاپی رائٹ کی حفاظت اور کاپی رائٹ کے علاقائی معاملات پر بہت باخبر رہنے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی اگر ڈیجیٹل دنیا کاپی رائٹ کے معاملے سے استفادہ کرتی ہے تو بدلے میں مصنفین کو بھی واجب معاوضہ ملنا ضروری ہے۔

سوال: کیا واقعی الیکٹرانک کتابیں مقبول ہوتی ہیں؟ اکا دکا مصنفین مثلاً اسٹیفن کنگ، کی کامیابی کے بارے میں سننے کو ملتا ہے لیکن بیشتر کے بارے میں ایسا نہیں ہے؟

جواب: میں یہاں پر میلکم گلیڈ ویل کے اس قول کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ ہر نئی چیز ایک Tipping Point پر پہنچتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان میں سے بیشتر کی ہیئت اور ساخت بھی Tipping Point تک جا پہنچے گی۔

سونی کی الیکٹرانک کتاب یا پڑھنے کی مشین (Sonye-book reader) جس کا اجرا حال ہی میں ہوا ہے، وہ دیگر الیکٹرانک کتابی آلات سے، جنھیں میں نے دس سال پہلے دیکھا تھا، مختلف ہے۔ ہاں میں یہ مانتا ہوں کہ ہم میں سے کوئی بھی "جنگ اور امن" (War and Peace) کو الیکٹرانک آلے کے ذریعہ نہیں پڑھے گا۔ یقیناً ہمارے دور میں تو نہیں لیکن کیا ہم لوگ سفری اطلاعات، کھانا بنانے کے نسخے، تعلیمی اطلاعات، انٹرنیٹ کے ذریعہ نہیں حاصل کریں گے؟ میرے خیال میں، ہم لوگ ایسا کریں گے ہم شاید ایک ایسا موقع چاہیں گے جس میں کتاب کو خریدنے کے ساتھ کرائے پر بھی حاصل کرنے کی سہولت ہو۔

سوال: کیا ہندوستان کی علاقائی زبانوں میں کتابیں شائع کرنے کی پین گوئن کی پیش رفت اسی ملک تک محدود رہے گی یا یہ ایک بڑے تجربے یا حکمت عملی کا حصہ ہے؟

جواب: ایک طرح سے دیکھا جائے تو یہ حکمت عملی کے خلاف ہے۔ ہم ابتدا سے ہی انگریزی زبان کے ناشر رہے ہیں۔ میرا یہ نظریہ ہے کہ غیر

ملکی زبانوں کے اشاعتی بازار انگریزی زبان کے بازار سے مختلف ہیں اور مجموعی طور پر یہ بہت منفعت بخش بھی نہیں ہیں۔ لہٰذا ہم بھی اتنا پر اعتماد نہیں ہو سکے۔ نہ ہی تجارت کی اقتصادیات کے تئیں اور نہ ہی اس بازار سے اپنی واقفیت کی بنا پر۔ تاکہ دوسری زبانوں مثلاً فرانسیسی، اسپینی یا اطالوی زبان میں اشاعت کتب کا سلسلہ اور کاروبار شروع کر سکیں۔

ہندوستان کی انفرادیت یہ ہے کہ یہاں بازار سے متعلق جانکاری کے تئیں ہم پر اعتماد ہیں۔ ہم یہاں بیس برسوں سے ہیں حالاں کہ ملیالم اور ہندی کتابوں کی تقسیم کا کاروبار انگریزی سے قدرے مختلف ہے، لیکن یہ ایک دم مختلف بھی نہیں ہے۔ پینگوئن کا برانڈ یہاں بہت مشہور ہے اور ہندوستانی زبان بولنے والوں میں بھی یہ برانڈ متعارف ہے۔ کسی کتاب پر چڑیا (پینگوئن) کی تصویر کی خاص اہمیت ہے۔ دوسری بات جو میں شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ ہم صرف انگریزی میں ہی کتاب شائع کر کے ہندوستان کے ساتھ انصاف نہیں کر رہے ہیں..... اور اگر ہم ہندوستان جیسے کثیر ثقافتی ملک، میں کتاب شائع کر رہے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ مختلف زبانوں میں بھی کتابیں شائع کریں۔ تیسری بات جو صرف ہم لوگ ہی نہیں سوچتے وہ یہ ہے کہ ہم ہندوستان کو مستقبل میں ایک بہت اہم بازار کے طور پر دیکھ رہے ہیں یہ ہماری کوتاہ بینی ہوگی اگر ہم خود کو انگریزی زبان تک محدود رکھیں۔ ہم اپنے پروگرام (علاقائی زبانوں میں اشاعت) میں تیزی سے اضافہ کر رہے ہیں اور اس سال ہم انگریزی کے 180 ٹائٹل کے مقابلے میں ہندوستان زبانوں میں 70 کے قریب کتابیں شائع کرنے جا رہے ہیں۔

سوال: گذشتہ چند برسوں میں پینگوئن انڈیا کے کاروبار میں ہنگامی طور پر اضافہ ہوا ہے لیکن آپ اس کے معیار کو لے کر کتنے مطمئن ہیں؟ آپ نے فکشن کی بعض ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو بہت کم اپیل کرتی ہیں؟

جواب: ٹھیک ہے۔ اگر آپ ہر سال دو سو کتابیں شائع کرتے ہیں تو ہر کتاب تجارتی اعتبار سے کامیاب نہیں ہوگی اور آپ یہ بھی نہیں کہہ سکتے ہیں کہ ہر کتاب عمدہ تھی۔ لیکن اگر آپ مجموعی طور پر ہماری کتابوں کو دیکھیں اور ان کا موازنہ اس ملک کے دوسرے ناشروں سے کریں تو میں یہ کہوں گا کہ طباعتی اور تحریری معیار کے اعتبار سے ہم بہتر ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ یہ محض ایک تاریخی اتفاق ہے کہ ہندوستانی فکشن کا ایک عظیم عہد تھا، جس میں اروندھتی رائے اور وکرم سیٹھ جیسے تخلیق کار پیدا ہوئے اور مجھے نہیں لگتا ہے کہ حالیہ چند برسوں میں نئی صلاحیتوں کو اس طرح فروغ نہیں دیا گیا ہے کہ ان کا مقابلہ ان کے پیش رووں سے کیا جا سکے میرا خیال ہے کہ اس میں غلطی ناشروں کی نہیں ہے۔ اگر نئے ٹیلنٹ دستیاب ہوتے تو ہم ان پر ضرور توجہ دیتے اور انھیں فروغ بھی دیتے۔

(بہ شکریہ "دی ہندو" 24 جنوری 2006)

□□□

لفظ

شاعر: آل احمد سرور

پروفیسر آل احمد سرور کا شمار اردو کے دیدہ ور نقادوں میں ہوتا ہے مگر وہ ایک نغز گو شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری ماضی کے اکتسابات کی حامل، حال کے میلانات کی ترجمان اور مستقبل کے امکانات کی نقیب ہے۔ سرور صاحب کی زندگی میں ان کے تین شعری مجموعے "سلسبیل"، "ذوق جنوں" اور "خواب اور خلش" شائع ہوئے۔ "لفظ" ان کا آخری شعری مجموعہ ہے۔

صفحات: 95، قیمت: -/64 روپئے

مقالاتِ مسعود

مصنف: مسعود حسین خاں

یہ کتاب ممتاز ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں کے سولہ علمی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اردو صوتیات، اقبال کا صوتی آہنگ، غالب کے خطوط کی لسانی اہمیت، اردو لغت نویسی کے مسائل وغیرہ مختلف موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔

صفحات: 230، قیمت: -/18.50 روپئے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

فرید احمد برکاتی

اردو میں مستعمل عربی مرکبات کیسے پڑھیں؟

اردو، میں مختلف انداز کے مرکبات مستعمل ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو عربی قاعدے کے مطابق ہیں یا عربی کی طرز پر بنے ہیں مثلاً بالترتیب، علی الحساب، اناالحق، ملک الموت۔ (ان کا تلفظ یوں کیا جاتا ہے۔ بِت ترتیب، عَلَلْ حِسَاب، اَنَلْ حَق، مَلَکُل مَوت۔) وہ عربی نام جن کا ایک جز 'عبد' ہوتا ہے، اسی زمرے میں آتے ہیں مثلاً عبداللہ، عبدالرحمٰن عبدالغفار وغیرہ۔

مرکب، الفاظ کے ایسے مجموعے کو کہا جاتا ہے جو ایک ساتھ مل کر اپنا مطلب ادا کرتے ہیں اور اکثر زیادہ مضمون یا مطلب کی کفایت کرتے ہیں۔ الفاظ کی اسی کفایت اور معانی کی زیادتی کا فائدہ حاصل کرنے کے لیے، اردو میں کئی نوعیتوں کے مرکبات استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ہندی یا دیسی ہیں، کچھ فارسی قاعدے کے مطابق بنے ہوئے ہیں اور کچھ عربی ہیں یا عربی کی طرز پر بنائے گئے ہیں۔ ہمیں یہاں ایسے ہی عربی مرکبات سے سروکار ہے اور اسی پر گفتگو کریں گے، لیکن صرف تلفظ کی جہت سے ان کی ساخت بنانے کے قاعدے اور معنوں سے فی الوقت بحث نہیں ہے۔

جن مرکبات کی اوپر مثالیں دی گئی ہیں (مثلاً بالترتیب، فی الحال، ملک الموت، عبدالستار) ان میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ یہ دو لفظوں سے مل کر بنے ہیں یعنی دو لفظوں کو جوڑ کر ایک ایک مرکب بنایا گیا ہے۔ ان مرکبات کو جن حرفوں کی مدد سے جوڑا یا ملایا گیا ہے، وہ ہیں ال۔ یعنی الف اور لام[1] ان کو پڑھتے وقت یا ان کے تلفظ میں الف کی آواز تو بالکل غائب ہو جاتی ہے لیکن لام کہیں پڑھا جاتا ہے (تلفظ میں آتا ہے) اور کہیں وہ بھی غائب[2] ہو جاتا ہے۔

الف اور لام کے اس غائب یا خاموش ہو جانے کی وجہ، عربی زبان میں حروف کی دوگونہ تقسیم ہے۔ یعنی عربی زبان کے حروفِ تہجی دو حصوں میں تقسیم ہیں۔ کچھ کو حروفِ شمسی کہا جاتا ہے اور کچھ کو حروفِ قمری۔ حروف کی شمسی و قمری تقسیم اور تلفظ پر ان کا عمل:

عربی میں حروفِ تہجی حروفِ شمسی اور قمری میں تقسیم کیے گئے ہیں۔

حروفِ شمسی: ت ث د ذ ر ز س ش ص ض ط ظ ن۔ حروفِ قمری: الف ہمزہ، ب ج ح خ ع غ ف ق ک ل م و ہ ی۔ حروفِ قمری و شمسی کی فہرست آپ نے دیکھی۔ اب ان کے فرق سے تلفظ کا قاعدہ بھی ذہن نشین کر لیجیے۔

قاعدہ: وہ مرکبات جن کے درمیان الف لام آتا ہے یا وہ مُفرد الفاظ جن پر الف لام کا (بطور سابقہ) اضافہ ہو، وہاں اگر الف لام کے بعد والا حرف قمری ہو تو لام تلفظ میں آئے گا۔ اور اگر شمسی ہو تو لام تلفظ میں نہیں آئے گا اور لام کے بعد والا حرفِ شمسی مشدّد بھی پڑھا جائے گا۔ مثلاً عبدالرَّزّاق، عبدُ السَّتّار، عبدُ الصَّمَد (شمسی) عبدالغفور، عبدالمالک، عیدالفطر، البتہ 'الف لام' والے مُفرد الفاظ میں الف بھی تلفظ میں آئے گا یعنی پڑھا جائے گا۔[3] مثلاً: اَلنّاصر، اَلرِّسالہ (شمسی) اَلمختار، اَلفاروق، اَلہند، اَلہلال، اَلبلاغ (قمری)۔

درست تلفظ پر عبور حاصل کرنے اور دونوں زُمروں کے حُروف کو یاد رکھنے کا آسان طریقہ اور سہل تدبیر یہ ہے کہ کسی ایک زُمرے کے حُروف (شمسی یا قمری) کو یاد کر لیا جائے دوسرا زُمرہ خود بخود یاد ہو جائے گا۔ تلفظ پر عبور حاصل کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دونوں زُمروں کے حروف سے شروع ہونے والے مُفرد الفاظ اور اُن سے بنے ہوئے مُرکّبات کی مثالیں اَزبَر کر لی جائیں یعنی حفظ یاد کر لی جائیں۔ صحیح املا یا درست لکھاوٹ کی مدد سے بھی درست تلفظ کیا جا سکتا ہے۔ حروفِ قمری والے مُفرَد الفاظ اور مرکّبات میں لام پر جزم (ساکن کی علامت/ ') لگی ہوئی ہوتی ہے، اور لام کے بعد والا حرف مُتحرّک (زبر، زیر یا پیش والا) ہوتا ہے۔ جب کہ شمسی زمرے میں لام کے بعد والا حرف مُشدّد (تشدید والا) ہوتا ہے اور لام پر کوئی حرکت نہیں ہوتی۔ ترقی اُردو بیورو کی املا کمیٹی نے بھی یہی سفارش کی ہے کہ حروفِ شمسی پر ایسی صورت میں تشدید لگائی جائے۔[4]

اب ہم طلبہ کی سہولت کے لیے اُردو میں مستعمل ایسے مرکبات کی ایک جامع فہرست دے رہے ہیں جن کی مدد سے درست تلفظ پر عبور حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اسمائے حُسنیٰ: یعنی اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں سے مرکب مسلمان مردوں اور عورتوں، کے نام سب سے عام مثالیں ہیں۔ جہاں تلفظ میں اکثر عوام ہی نہیں غیر اُردو داں خواص بھی غلطی کر جاتے ہیں۔

اللہ (اسم ذات)، اَلاوّل، الاحد، اَلباقی، اَلباری، اَلباسط، اَلبصیر، اَلجبّار، اَلحلیم، اَلحکیم، اَلخالق، اَلحفیظ، اَلعلی، اَلغفّار، اَلغفور، اَلقوی، اَلقادر،

الکریم، اللطیف، الاولیٰ۔ یہ سب اسما حروفِ قمری سے شروع ہوتے ہیں اور ان میں 'ل' پڑھا جاتا ہے، غیر ملفوظ یا خاموش نہیں ہے۔ چنانچہ ان سے مُرکّب (بندوں کے) نام یوں ہوں گے۔ (عبد، کے معنی عربی میں 'بندہ یا غلام' کے ہیں اور اَمَۃ، کے معنی 'بندی' 'کنیز' کے ہیں):

عبدُ اللہ، اَمَۃُ اللہ، عبدُ الاَحَد، عبدالباری، عبدالباسط، عبدُ البصیر، اَمَۃُ الباری، امۃُ الکریم، عبدُ العلی، عبدُ الغفور، عبدُ القادر، عبدُ القدیر، عبدُ الکریم، عبدُ اللطیف، عبد الولی، اسی طرح ذوالجلال و الاکرام (ذل جلال ول اِکرام) اور ذوالمِنَن (ذل مِنَن، تلفظ) یعنی احسانوں والا، مراد اللہ تعالیٰ) عزیزُ الجبّار۔ (ذل)

حروفِ شمسی سے شروع ہونے والے اسمائے حُسنیٰ میں 'ل' پڑھا نہیں جاتا۔ ان سے بننے والے (مردوں اور عورتوں کے) نام یہ ہیں:۔

عبدُ التّواب، عبدُ الرّحمٰن عبدُ الرّب، عبدُ الصّبور، عبدُ السّتار عبدُ الصّمد، عبدُ الرّزاق، عبدُ الشکور، عبدُ الدّائم، اَمَۃُ الرّحمٰن، عبدُ النّاصر، وجیہُ الدّین، نجیم الدّین، مُعینُ الدّین، اکبرُ الدّین، کچھ اور مُرکّب نام، خطابات یا القاب (ج لقب):۔ (شمسی): شمسُ الضّحیٰ، بدرُ الدُّجیٰ، وحیدُ الزّماں، کریمُ النّفس، سلیمُ الطّبع، یحییٰ الزّماں، فریدُ الدّہر، خیرُ النّساء، شمسُ النّساء، عینُ الشّمس۔

یہ سب (مندرجۂ بالا) شمسی حروف والے مرکّبات ہیں۔ لہٰذا ان میں لام نہیں پڑھا جائے گا۔

(قمری): شمسُ الہُدیٰ، عبدُ الہادی، بحرُ الکاہل، وسیعُ المَشرَب، نورُ القمر، محسنُ المُلک، وقارُ المُلک، فریدُ العصر قُرّۃُ العَین، نورُ العَین، خیرُ اللہ، وجیہُ اللہ، عطاءُ اللہ، نورُ اللہ، عبدُ المالک، خیرُ القرون، فصیحُ الاُمم، عالمُ الغیب بعلمِ الغیب، عینُ الیقین، حقُّ الیقین، علیمُ المزاج، ابنُ العربی، شیخُ الاسلام، عبدُ الوہاب، عطاءُ المُلک، حکیمُ الامت، محبوبُ الٰہی، ذوالفقار (ذل فقار)، ذوالقرنین، (ذل۔ قر۔ نین)، بدیعُ الجمال، علی الحساب (علل۔ حساب)۔ شقُّ القمر، (معجزۂ رسول اللہ)، شفیعُ الوریٰ، غوثُ الاعظم، عظیمُ المرتبت، (بڑے مرتبے والا) فی الاصل (اصل میں) فی الوقت (فِل وقت) (اس وقت)۔ فی الحال (فِل حال) ابو الکلام (اَبُل۔ کلام)۔ ابو العلا، ابو الفضل، ابو الخیر (ابُل علا۔ ابُل خیر۔ ابُل فضل)۔ فقیدُ المثال (بے نظیر)۔ عیدُ الفطر۔

مندرجۂ بالا سب مرکّبات میں 'لام' تلفظ میں آتا ہے، کیونکہ یہ قمری ترکیبات ہیں۔ اب ایسے ہی کچھ شمسی مرکّبات دیکھیے اور زبانی یاد کیجیے:۔

(شمسی) عِندَ الطّلب (مانگتے ہی، جب بھی طلب کیا جائے)۔ اظہر مِن الشّمس (مثلِ شمس)۔ واضح، روشن، جس کے لیے دلیل کی ضرورت نہ ہو۔ بدرُ الدُّجیٰ (اندھیری کا چاند) رفیعُ الشان، عدیمُ النّظیر، قمرُ الدّین، اَمَۃُ السّلام، عبدُ السّلام، بابُ الرّحمت، عیدُ الضّحیٰ۔ دارُالسّلام، عظیمُ الشان۔ عیدین (دونوں عیدوں) کے عربی نام قمری حروف سے شروع ہوتے ہیں۔ لام پڑھا جاتا ہے) 1۔ عیدُ الفطر 2۔ عیدُ الاضحیٰ

وہ مفرد الفاظ جن پر الف لام (اَل) لگا ہوا ہو، ان میں بھی یہی قاعدہ جاری ہوگا، البتہ اُن میں الف بھی پڑھا جائے گا۔ جیسے: الہلال، القمر، الفاروق (قمری) النّاصر، الرّسالہ، الرّیاض، الشّارقہ (شمسی) القعدہ ہجری تقویم (کیلنڈر) کے مہینوں کا تلفظ:

مُحرّم الحرام (ق) صَفَر المُظفّر (صَفر۔ ق) ربیع الاوّل (ق) ربیع الثانی (ش) جمادی الاوّل (ق) جمادی الثانی (ش) رجب المُرجّب (ق) شعبانُ المُعظّم (ق) رمضان المبارک (ق) شوّال المکرّم (ق) ذو القعدہ (ذی قعدہ بھی کہتے ہیں) ذوالحجّہ (ق) (ذل حجہ) ذی الحج (ذل حج بھی تلفظ کرتے ہیں)۔

اساتذہ اور اعلیٰ درجات کے طلبہ کے لیے ایک وضاحت:

ہم نے اِملا (یا لکھاوٹ) کے اعتبار سے کسی مرکّب میں، حروفِ شمسی و قمری کی جو شناخت (پہچان) مقرر کی تھی، وہ یہ تھی کہ حروفِ شمسی والے مُرکّبات میں ال (الف، لام) کے بعد والا حرف مُشدّد ہوتا ہے یعنی اس پر تشدید لگی ہوئی ہوتی ہے۔ جب کہ حروفِ قمری والے مُرکّبات میں الف لام کے بعد والا حرف متحرک اور بعض وقت لام پر جزم بھی لگا دی جاتی ہے۔ یہ پہچان اپنی جگہ بالکل درست ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ اُردو میں اکثر زیر، زبر، پیش وغیرہ (جن کو اعراب کہا جاتا ہے اور جزم و تشدید بھی اُسی میں شامل ہیں) لگانے کا رواج بہت کم ہے۔ ابتدائی درجات کی کتابوں ہی میں اس کا اہتمام ہوتا ہے۔ دوسری ضروری بات جس کی طرف یہاں خصوصیت سے توجہ دلانا مقصود ہے، یہ ہے کہ ل (لام) حروفِ قمری میں سے ہے اس پر جب الف لام کا اضافہ کیا جاتا ہے تو دو لام ہو جاتے ہیں۔ اس کی ایک عام اور سامنے کی مثال 'عبداللطیف' ہے۔ گذشتہ سطور میں ہم نے اس کو (جو دو لفظوں سے مرکّب ایک نام ہے) بغیر تشدید کے یوں لکھا ہے: عبدُ اللطیف۔ اور یہ غلط بھی نہیں بالکل صحیح ہے۔ لیکن اکثر یہ تشدید کے ساتھ لکھا ہوا ملتا ہے "عبدُ اللّطیف" یعنی لطیف کے لام پر تشدید لگائی جاتی ہے۔ اور ال کو بغیر کسی

حرکت کے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کلام اللہ (قرآن مجید) کا طرز کتابت بھی یہی ہے۔ اس طرح کے مقامات پر دوسرے لام پر تشدید لگی ہوتی ہے (قرآن مجید میں اللّطیف اللّھم، اللّاذب الفاظ اِس طرز کتابت کی مثالیں ہیں) اس سے ہماری بتائی ہوئی شناخت میں بظاہر استثنا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن بغور دیکھا جائے تو یہ استثنائی صورت حال نہیں ہے۔ تشدید در اصل ایک ساکن اور ایک متحرک سے مل کر بنتی ہے۔ عبد اللطیف اور اس طرح کے دوسرے مرکبات کو خواہ کسی طرح لکھا جائے صوتی اعتبار سے نتیجہ ایک ہی نکلے گا۔ اردو، اساتذہ اگر چاہیں تو اپنی سہولت اور ذہین طلبہ کی تشفی کے لیے حرف لام کو (شمسی وقمری زمروں میں) مشترک قرار دے کر پڑھا سکتے ہیں۔

ایک ضروری اِنتباہ:

الف لام (ال) والے بعض مرکبات ایسے ہیں جن کی املا میں (لکھنے میں) اکثر طلبہ ہی نہیں اساتذہ سے بھی غلطی سرزد ہوتی ہے۔ بعض مرکبات میں وہ اپنی طرف سے ایک الف کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً، بالقصد بالفعل (بل ـ فعل) بالمشافہہ (بل ـ مُشا ـ فہہ) بالارادہ، ان مرکبات کی غلط املا یہ ہوتی ہے۔

باالقصد، باالفعل، باالمشافہہ، اور بعض لوگ تو باالکل (بجائے بالکل) لکھ دیتے ہیں[5] ایسے ہی چند الفاظ یا مرکبات اور ہیں جن کی املا میں اکثر غلطی کی جاتی ہے۔ ان کی درست اور صحیح املا ذہن نشین کر لینا چاہیے:۔

کالأنعام (ک + ال + أنعام ـ کل أنعام تلفظ کیجیے)، باللہ (ب + اللہ ـ تلفظ: بلاہ) اس کے معنی ہوتے ہیں اللہ کی قسم۔ الحمدُ لِلّٰہ (الحمدُ + لِ + اللہ)۔ لِلّٰہ (لِ + اللہ) اللہ کے لیے، اللہ کے واسطے نقش کالحجر (نقش ک + ال + حجر) پتھر کا سا نقش، امٹ

حواشی

(1) عربی میں ان کو الف لام تعریف کہا جاتا ہے۔ اور جس لفظ پر بطور سابقہ (Prefix) ان کا اضافہ کیا جاتا ہے (یعنی الف لام لگایا جاتا ہے) اس کو معرف باللام، کہا جاتا ہے۔

(2) یہ غائب ہونا بالکل ایسا ہی ہے جیسے انگریزی زبان کے بعض الفاظ میں ایک یا دو حرفوں کا تلفظ نہیں کیا جاتا اور انھیں (Silent) خاموش فرض کیا جاتا ہے۔ جیسے Pleasure,Light,Calm, الفاظ میں :Gh,L,Ea,U کا تلفظ۔ (پلے ژر، لائٹ، کام)۔

(3) اردو بولنے والے لوگ اس قاعدے سے اکثر ناواقف ہونے کے باوجود محض مشق وممارست (Practice) سے درست تلفظ پر قدرت رکھتے ہیں۔ غیر اردو داں ماحول میں بھی جن بچوں نے بخوبی قرآن مجید پڑھا ہوتا ہے، انھیں بھی درست اور صحیح تلفظ پر عبور حاصل ہو جاتا ہے۔ قاعدہ جاننے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

(4) املا یا لکھاوٹ کا یہ طریقہ عربی زبان میں پہلے ہی سے رائج چلا آتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ایسے مقامات پر حروفِ شمسی کو تشدید کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔

(5) ہجری مہینوں کے ناموں کا تلفظ ہمارے یہاں اصل سے کچھ مختلف ہے۔ چنانچہ ہم محرم، صفر، رجب، شعبان، رمضان، شوال، وغیرہ مختصر کر کے بولتے ہیں۔ تیسرا، چوتھا پانچواں اور چھٹے مہینوں کے نام اصل عربی میں علی الترتیب الاول، الآخر، الاولیٰ، الاخریٰ کہلاتے ہیں اور جمادی، کا تلفظ تو شاید ہی صحیح طور پر کوئی کرتا ہو۔ کیونکہ یہ عربی میں "جُمادیٰ" ہے۔

(6) لیکن انا الحق ان میں شامل نہیں کیونکہ یہ (انا+الحق) سے مرکب ہے۔

□□□

جدیدیت کی فلسفیانہ اساس

مصنف: پروفیسر شمیم حنفی

پروفیسر شمیم حنفی کی اس کتاب میں جو جدیدیت اور نئے فکری اور فلسفیانہ میلانات کے سیاق میں حوالے کی حیثیت رکھتی ہے وجودیت اور مارکسیت سمیت ادب، زبان اور آرٹ سے تعلق رکھنے والے تمام اہم مکاتب فکر اور تصورات سے بحث کی گئی ہے۔ ادب میں قدیم و جدید کی کشمکش اور نئے طرزِ احساس و اظہار کے حوالے سے ایک اہم کتاب۔

صفحات: 292، قیمت: -/114 روپے

نئی شعری روایت

مصنف: پروفیسر شمیم حنفی

اردو میں جب جدیدیت کے رجحان نے زور پکڑا اور اس وقت کے نئے لکھنے والوں میں اسے غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی تو اس کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے موافق اور مخالف دونوں طرح کی آرا کو سامنے رکھ کر تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

صفحات، 239، قیمت: -/96 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 110 066

وہاب قیصر

خواتین اور کمپیوٹر ٹیکنالوجی

ٹیکنالوجی نے سائنس کی ترقی میں ہمیشہ اہم کردار نبھایا ہے لیکن بیسویں صدی کے اختتام تک سائنس اور ٹیکنالوجی کا منظر نامہ یکسر بدل گیا اور ٹیکنالوجی کو سائنس کی ترقی پر انحصار کرنا پڑا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی تمام حالیہ ایجادات پر نظر ڈالنے پر کمپیوٹر سے بڑھ کر کوئی ایجاد نظر نہیں آتی۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر کمپیوٹر اثر انداز نہ ہوا ہو۔ 1980 سے پہلے کمپیوٹر صرف ہمارے تصور کی حد تک محدود تھا اور حقیقت میں دیکھا جائے تو ان دنوں یہ ایک پر اسرار دیوہیکل اور طاقتور مشین کی حیثیت رکھتا تھا جو ایک بڑے سے کمرے پر قابض رہتا۔ 1980 کے بعد جب اس نے پورٹیبل مائیکرو کمپیوٹر کی شکل اختیار کر لی تو پرسنل کمپیوٹر (PC) کی حیثیت سے یہ ہر کسی کو دستیاب ہونے لگا۔ یہی وجہ تھی کہ 1980 کا عشرہ ساری دنیا کے لیے نئی ٹیکنالوجی عشرہ قرار پایا۔ نئی ٹیکنالوجی کمپیوٹر پر منحصر ڈیجیٹل اور انفارمیشن ٹیکنالوجی پر محیط ہوتی ہے۔ جس کا ایک عملی استعمال انٹرنیٹ کے طور پر مقبول ہوا ہے۔ اس کے اہم خدوخال میں اطلاعات کی پروسیسنگ، ان کی ترسیل اور ان کو محفوظ کرنے کے لیے کمپیوٹر پروسیس کرنے والے نظام شامل رہتے ہیں۔ نئی ٹیکنالوجی کی تحقیق و ترقی میں جن امور کو پیش نظر رکھا جاتا ہے ان میں مشینوں میں تیز تر رفتار کا حصول، جسامت میں حد درجہ کمی اور کمپیوٹر کے استعمال کی نت نئی راہوں کی تلاش قابل ذکر ہیں۔ چنانچہ کمپیوٹر ٹیکنالوجی عصر حاضر کی سماجی، معاشی، سیاسی، ثقافتی اور خانگی زندگی کے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

کمپیوٹر سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم کے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ تعلیم حاصل کرنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد میں نمایاں فرق ہے۔ شروع ہی سے کمپیوٹر سائنس میں بیچلر، ماسٹر اور ڈاکٹریٹ ڈگری حاصل کرنے والوں کی جملہ تعداد کا بہت کم فیصد حصہ لڑکیوں پر مشتمل رہا ہے۔ امریکہ میں 1990 سے 1992 کے درمیان کیے گیے ایک تحقیقی سروے کے مطابق ان کورسوں میں تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں کے فیصد میں 1976 سے 1986 تک بہت کم اضافہ ہوا اور پھر اس میں مسلسل کمی واقع ہوتی گئی۔ ذیل کا جدول یہ ظاہر کرتا ہے کہ گیارہ سال کے عرصے میں کمپیوٹر سائنس کے مختلف کورسوں میں لڑکیوں کا تناسب کیا تھا۔

سال	بیچلر ڈگری فیصد	ماسٹر ڈگری فیصد	ڈاکٹریٹ فیصد
1976	19.8	14.5	5.7
1977	23.9	16.7	6.7
1978	25.8	18.7	8.5
1979	28.1	18.8	9.7
1980	30.3	20.9	12.2
1981	32.5	23.0	11.1
1982	34.8	26.5	11.1
1983	36.4	28.3	12.1
1984	37.2	29.3	10.6
1985	36.9	28.7	9.8
1986	35.8	29.9	12.1

امریکہ میں 1976 سے 1986 تک کمپیوٹر سائنس کی ڈگریاں حاصل کرنے والوں میں خواتین کا سالانہ فیصد

اس تحقیقی سروے کے مطابق کمپیوٹر سائنس کے وہ شعبہ جات جن میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی جاتی ہے وہاں کے اساتذہ میں لکچرر اور ریڈر کے عہدوں پر صرف 10 فیصد خواتین فائز تھیں جب کہ خاتون پروفیسروں کی تعداد صرف 4 فیصد تھی۔ کمپیوٹر انجینئرنگ میں ڈگری دینے والے شعبوں میں 7 فیصد لکچرر، 4 فیصد ریڈر اور 2 فیصد پروفیسر خواتین تھیں۔ کمپیوٹر سائنس اور کمپیوٹر انجینئرنگ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینے والے شعبوں میں 30 فیصد شعبے ایسے تھے جن میں کوئی بھی خاتون پروفیسر نہیں تھی۔ 34 فیصد شعبوں میں صرف ایک خاتون پروفیسر اور 36 فیصد شعبوں میں دو یا دو سے زائد خواتین پروفیسر برسر خدمت تھیں۔

اس سروے میں یہ بھی دیکھا گیا کہ امریکہ میں کمپیوٹر میں مہارت کے ساتھ ڈاکٹریٹ ڈگری والی کل وقتی خواتین پروفیسروں کی اوسط آمدنی، مرد پروفیسروں کی اوسط آمدنی کا 78 فیصد حصہ تھی۔ آمدنی کا یہ فرق دوسرے تمام سائنسی شعبوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھا۔ اسی طرح ماسٹر ڈگری والی خواتین کی آمدنی، مردوں کی آمدنی کا 93 فیصد اور بیچلر ڈگری والی خواتین کی آمدنی مردوں کی آمدنی کا 98 فیصد تھی۔ یہاں تک کہ کسی رسالے کے لیے لکھے گئے مضمون پر بھی خواتین

کو مردوں کے مقابلے کم معاوضہ ملا کرتا تھا اور مرد اور خاتون کے بایوڈاٹا میں یکسانیت رہنے کے باوجود مرد کو ریڈر اور خاتون کو لکچرر کی پوسٹ حاصل ہوتی تھی۔ اس بات کا پتہ چلا ہے کہ خواتین اور مردوں کے درمیان یہ فرق دوسری سائنٹفک اور انجینئرنگ کے شعبوں میں بھی تھا۔

برطانیہ میں کی گئی ایک تحقیق کے مطابق وہاں کی یونیورسٹیوں میں 1979 میں کمپیوٹر سائنس کی ماسٹر ڈگری کورس کے طالبات کی تعداد 24 فیصد، 1984 میں 15 فیصد اور 1989 میں تو 10 فیصد سے بھی کم تھی۔ انڈر گریجویٹ کورسوں میں طالبات کا فیصد 1985-86 میں 42.4 فیصد اور 1989-90 میں 44.4 فیصد رہا۔

ترقی یافتہ ممالک میں اگرچہ سائنس اور انجینئرنگ کے کئی شعبوں میں بیچلر ڈگری حاصل کرنے والوں میں لڑکیوں کا فیصد بڑھ رہا ہے لیکن اس کے باوجود کمپیوٹر سائنس میں ان کے فیصد میں تیزی کے ساتھ کمی واقع ہو رہی ہے۔ نیشنل سائنس فاؤنڈیشن امریکہ کی ایک رپورٹ کے مطابق 1985 سے 1995 تک کمپیوٹر سائنس میں خواتین کا فیصد 36 سے گھٹ کر 28 ہو چکا تھا۔ رپورٹ میں اس بات کا بھی خدشہ ظاہر کیا گیا تھا کہ آنے والے دنوں میں اس تناسب میں مزید کمی آئے گی کیونکہ اسکولوں میں لڑکوں کے مقابلے میں بہت کم لڑکیاں کمپیوٹر کورس کی جانب متوجہ ہوئی تھیں۔ چنانچہ 1999 میں ہائی اسکولوں میں منعقدہ کمپیوٹر سائنس کے Advance placement کے مقابلے میں صرف 17 فیصد طالبات نے حصہ لیا تھا۔ جبکہ طبعیات کے لیے 20 فیصد، کیمیا کے لیے 42 فیصد، حیاتیات کے لیے 56 فیصد اور Calculus کے لیے 47 فیصد طالبات نے شرکت کی تھی۔

امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں کمپیوٹر سائنس اور ٹیکنالوجی کی اعلیٰ تعلیم میں خواتین کی صورت حال کے جائزے کے بعد جب ہم ہندوستان کی جانب متوجہ ہوتے ہیں تو یہاں کی صورتحال میں اکیسویں صدی میں بہتری آئی ہے خصوصاً جنوبی ہند کی ریاستوں کرناٹک، آندھرا پردیش اور تامل ناڈو میں۔ کمپیوٹر اور انفارمیشن ٹیکنالوجی میں تو اچھی خاصی تعداد میں لڑکیاں دلچسپی لے رہی ہیں۔ کافی کوشش کے باوجود ہمیں اس ضمن میں اعداد و شمار دستیاب نہیں ہو سکے اس لیے ان کی روشنی میں ہم وثوق کے ساتھ جائزہ نہیں لے سکتے۔ البتہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے اہم Tool انٹرنٹ اور On-line خدمات سے ہمارے ملک کی خواتین کس قدر استفادہ کر رہی ہیں اس کا مختصر جائزہ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق ضرور لیا جا سکتا ہے۔ ایک سروے کے مطابق 2005-06 کے درمیان ہمارے ملک میں انٹرنٹ استعمال کرنے والی خواتین کا فیصد 28 سے بڑھ کر 32 ہو چکا ہے۔ اس بات کا اندازہ بھی لگایا گیا ہے کہ آئندہ دو سال میں خواتین کا یہ تناسب 40 فیصد تک پہنچ جائے گا۔ انٹرنٹ کو مختلف اغراض کے لیے استعمال کرنے والی خواتین کا جائزہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کی جملہ تعداد کا 96 فیصد e-mail کے لیے، 44 فیصد Chating کے لیے، 63 فیصد Browsing کے لیے، 15 فیصد Matrimonials کے لیے، 36 فیصد Astrology کے لیے اور 29 فیصد تحقیق کے لیے استعمال کر رہی ہیں۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے اس ترقی یافتہ دور میں جہاں خواتین ہر میدان میں مردوں کے دوش بدوش، قدم سے قدم ملا کر چل رہی ہیں تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی کیا بات ہوگئی کہ وہ کمپیوٹر سائنس، ٹیکنالوجی اور انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں مردوں سے پیچھے رہ گئیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ یہ بات عام مشاہدے کی ہے کہ کمپیوٹر گیم اور اسپورٹس اور تعلیمی سافٹ ویئر میں لڑکوں کے مقابلے میں بہت کم لڑکیاں دلچسپی رکھتی ہیں۔ آئے دن منعقد ہونے والے کمپیوٹر کیمپوں میں شرکت کی غرض سے بھیجنے کے لیے والدین، لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ لڑکیوں کو پہلے تو ان میں شرکت کی اجازت نہیں ملتی اور اگر اجازت ملتی بھی ہے تو اس کے لیے انھیں منت وساجت کرنی پڑتی ہے۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ کمپیوٹر سائنس کی اعلیٰ تعلیم وہی طلبا حاصل کر سکتے ہیں جنھوں نے ابتدائی جماعتوں میں ریاضی کو بطور اختیاری مضمون لیا ہو۔ چونکہ بہت کم لڑکیاں ریاضی کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے لیتی ہیں اس لیے وہ چاہتے ہوئے بھی کمپیوٹر سائنس اعلیٰ تعلیم کے لیے اختیار نہیں کر سکتیں۔ کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کرنے میں لڑکوں کی رہنمائی کرنے والوں کی کمی نہیں رہتی اور انھیں ہر سمت سے بڑھاوا ملتا ہے۔ جب کہ لڑکیوں کے لیے ہمت افزائی کرنے والوں کا فقدان ہے۔ اکثر اوقات لڑکیوں کو اپنے ساتھی لڑکوں یا مرد اساتذہ کی اذیتوں کا شکار ہوتے ہوئے بھی دیکھا گیا ہے۔

کمپیوٹر ٹیکنالوجی میں خواتین کی کم دلچسپی کے باوجود چند خواتین ایسی ضرور گزری ہیں جنھوں نے اس کی تحقیق و ترقی، منصوبہ بندی اور ڈیزائننگ میں حصہ لے کر اپنے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ ان میں سب سے پہلی خاتون Ada Lovelace تھی۔ جس کو اولین کمپیوٹر پروگرامر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس کی پیدائش 1815 میں لندن میں ہوئی اور 37 سال کی عمر میں 1852 میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا پورا نام Ada Augusta Byron تھا اور وہ انگریزی کے مشہور شاعر Lord Byron کی بیٹی تھی۔ پیدائش سے پہلے ہی ماں باپ کے تعلقات منقطع ہو گئے اور اس کی تعلیم و تربیت ماں کی نگرانی میں ہوئی۔ کنگ ولیم ہشتم سے شادی کے بعد Countess of Lovelace کہلائی اور Ada Lovelace کے نام سے کمپیوٹر کی دنیا میں مشہور ہوئی۔ اپنے وقت کے مشہور سائنس دانوں سے مراسلت اور اپنی محنت کی بدولت اس کو ریاضی میں مہارت حاصل ہوئی۔ کمپیوٹر کے باوا آدم Charless Babbage سے ملاقات نے اس کی زندگی کا رخ موڑ دیا۔ Babbage کی سرپرستی کے علاوہ اس کے ڈیزائن کردہ Difference Engine اور Analytical Engine کو سمجھنے میں مدد ملی۔ Analytical Engine حسابات کی انجام دہی کے لیے نظری طور پر ڈیزائن کیا گیا میکانیکل کمپیوٹر تھا۔ ٹیکنالوجی کے ترقی یافتہ

نہ ہونے کی وجہ سے ان دنوں اس نظریاتی کمپیوٹر کو عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا۔ اس کمپیوٹر کے جو بنیادی خدوخال تھے وہ آج کے الکٹرانک کمپیوٹر کے مشابہ تھے۔ اس کمپیوٹر سے متعلق Ada کے تصورات اور معلومات Babbage سے بھی زیادہ واضح تھے۔ چنانچہ Analytical Engine کے موضوع پر اطالوی زبان میں لکھے گئے مقالے کا جب Ada نے 1833 میں ترجمہ کیا تو اس نے اپنی طرف سے مقالے میں اتنا مواد شامل کیا تھا کہ ترجمے کی طوالت اصل مقالے سے تین گنا سے زیادہ ہوگئی۔ اس ترجمے میں Ada نے پیش قیاسی کی تھی کہ جب یہ مشین پایۂ تکمیل کو پہنچے گی تو اس کو پیچیدہ موسیقی کی کمپوزیشن میں گرافکس کی ڈیزائننگ اور عملی طور پر سائنسی اغراض کے لیے استعمال میں لایا جاسکے گا۔

Ada Lovelace نے Analytical Engine کو چلانے کے لیے کوڈ بنایا اور Bernoulis Numbers کے لیے ان کوڈوں پر مشتمل پلان لکھا جو دنیا کا پہلا کمپیوٹر پروگرام کہلاتا ہے۔ Ada کا ایک اور کارنامہ پروگرام میں Loop کی شمولیت کا ہے۔ آج بھی ہم پروگرام کے کسی چھوٹے سے حصے کو بار بار دہرانے کے لیے Loop کا استعمال کرتے ہیں جس کو کمپیوٹر کی زبان میں Subroutine کہا جاتا ہے۔ اس کی ایجاد کا سہرا بھی Ada کے سر ہی جاتا ہے۔

کمپیوٹر کے لیے Ada کی خدمات کا اعتراف کرنے اور اس کو اعزاز بخشنے کے لیے امریکی فوج میں استعمال کے لیے 1979 میں رائج کی گئی High Level Language کو Ada Language سے موسوم کیا گیا۔

کمپیوٹر کی دنیا میں اپنی شناخت بنانے والی خواتین میں Grace Murray Hopper (1906-1992) کا نام نمایاں ہے۔ اس کا شمار امریکہ کے اولین پروگرامروں میں ہوتا ہے۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی میں کارہائے نمایاں انجام دینے سے پہلے اس نے امریکہ کی مختلف یونیورسٹیوں میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیے۔ امریکی بحریہ میں مختلف عہدوں پر فائز رہتے ہوئے وہ Rear Admiral کی حیثیت سے سبک دوش ہوئی۔ اس نے Cobol زبان کی تصدیق کی اور اس کو بحریہ میں استعمال کرنے کے لیے ترقی دی۔ وہ پنٹاگن میں Automation Command Naval Data کی مشیر رہی۔ اس نے APT زبان کی ایجاد کی اور خودکار پروگرامنگ کے تصور کو عملی جامہ پہنایا جس کو Cobol زبان کے لیے استعمال کیا جاسکا۔ 1952 میں Compiler کی ایجاد بھی اس نے کی۔ کمپائلر دراصل ایک ایسا سافٹ ویئر ہوتا ہے جو کمپیوٹر کے لیے لکھے گئے کسی بھی زبان کے پروگرام کو Binery Coded language Machine میں تبدیل کردیتا ہے جس کو کمپیوٹر سمجھتے ہوئے کمانڈ کے مطابق کام انجام دیتا ہے۔ 1957 میں اس نے کمرشیل طور پر دستیاب High Level Language تیار کیا تھا جو Flow-Matic کہلاتی ہے۔

Grace Hopper نے پہلے الکٹرومیکانیکل کمپیوٹر Mark-I کے لیے Trouble shooting skills کو ترقی دی جو آج بھی عصری الکٹرانک کمپیوٹر میں مستعمل ہیں۔ Trouble shooting کمپیوٹر میں پائی جانے والی کسی خرابی کا پتہ لگانے کو کہتے ہیں۔ Computer Bug اور Debugging جیسی کمپیوٹر کی اصطلاحیں بھی Hopper کی مدون کردہ ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ 1944 میں Mark - I کمپیوٹر میں ہزاروں تاروں پر مشتمل الکٹرومیکانیکل Relays کے پیچھے میں ایک Bug یعنی کیڑا پھنس گیا تھا اور وہ نکلنے کی کوشش میں Relays سے ٹکراتے ہوئے کمپیوٹر کی کارکردگی کو متاثر کررہا تھا۔ Hopper نے کمپیوٹر کی خرابی کو دور کرنے کے کئی جتن کیے اور آخر میں اس نے کیڑے کے پھنس جانے کا پتہ لگایا جس کو نکالنے کے بعد کمپیوٹر ٹھیک طور پر کام کرنے لگا۔ چنانچہ آج بھی کمپیوٹر کی خرابی کو کمپیوٹر بگ سے اُسے دور کرنے کو Debugging یعنی کیڑے کو باہر نکال دینے سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ Hopper کی انھی خدمات کی بنا پر اس کو Legion of merit کا اعزاز عطا کیا گیا تھا۔ 1969 میں Data processing Management Association نے Hopper کو 1st Computer science man of the year سے موسوم کیا۔ اس کے اعزاز میں 1971 سے ہر سال نوجوان پروگرامر کو Grace Murray Hopper Award دیا جاتا ہے۔

1945 میں امریکی فوج میں کمپیوٹر کی واقفیت رکھنے والی 75 ریاضی داں خواتین کو شامل کیا گیا تھا جن کے ذمہ یہ کام تھا کہ ایک دیے گئے دستور العمل کی مدد سے کمپیوٹر کا استعمال کرتے ہوئے دوسری جنگ عظیم میں بری فوج کے لیے دشمن پر نشانہ داغنے کی صحیح سمت کا تعین کرسکیں۔ یہ خواتین ان دنوں انسانی کمپیوٹر کہلاتی تھیں۔ ان میں Jean Jenning Bartik اور Betty Holberton ایسی خواتین ہیں جنھوں نے کمپیوٹر سافٹ ویئر میں اپنی گراں قدر خدمات کی بدولت شہرت حاصل کی۔ 1945 کے اواخر تک Jean Bartik ان چھ انسانی کمپیوٹروں میں سے تھیں جن کو الکٹرانک کمپیوٹر ENIAC کو پروگرام کرنے کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ اس کو بعد میں BINAC اور UNIVAC کمپیوٹروں کو پروگرام کرنے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی تھی۔ 1997 میں Jean Bartik اور اس کی ساتھی پروگراموں کو Women in Technology International Hall of fame کی فہرست میں شامل کیا گیا تھا۔ امریکہ کی Missouri state university نے اس کو 2002 میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری پیش کی تھی۔

دوسری خاتون کمپیوٹر Betty Holberton نے دوسری جنگ عظیم کے بعد UNIVAC کی تحقیق کی جو C-10 نامی Instruction code کمپیوٹر کو کنٹرول فراہم کرنے کا باعث بنا۔ اس نے کمپیوٹر کے لیے ایک ایسی زبان کی اختراع کی جس میں نئے Mnemonics یعنی کوڈ جیسے جمع کے لیے اور

تفریق کے لیے b بنائے۔ Cobol اور Fortran زبانوں کو دنیا بھر میں استعمال کیے جانے والے کمپیوٹروں کے لیے سودمند بنایا۔ ان خدمات کے صلے میں 1990 کی دہائی میں اسے Pioneer of Computer کا اعزاز ملا۔

کمپیوٹر کی ماہر خاتون ڈاکٹر ڈورتھی ای. ڈیننگ (Dr. Dorothy E. Denning) نے Cryptography میں 100 سے زیادہ مقالے اور دو کتابیں Cryptography and Data Security اور Information warfare and security لکھیں جو بالترتیب 1982 اور 1999 میں شائع ہوئیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ Cryptography کمپیوٹر کی وہ تکنیک ہے جس کے ذریعے کسی پروگرام کو کمپیوٹر میں اس طرح محفوظ کردیا جاتا ہے کہ اس تک کسی کی رسائی نہیں ہو پاتی۔ Denning کو امریکہ کا نیشنل کمپیوٹر سیکورٹی ایوارڈ دیا گیا تھا۔ 2000 میں اس کو Techno Security Professional of the year کا اعزاز پیش کیا گیا۔

کمپیوٹر سائنس اور ٹیکنالوجی کی ماہر Dr. Radia Perlman پیشے سے ایک انجینئر ہے جس نے 1988 میں کمپیوٹر سائنس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ نٹ ورکنگ اور Security protocols میں کافی مہارت رکھتی ہے۔ وہ Spanning tree algorithm کی موجد ہے جسے انٹرنٹ کی نٹ ورکنگ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ Routing Security پر اس کی تحقیق بہت اہم ہے۔ کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے میدان میں اس کی خدمات کو سراہتے ہوئے اس کو Communication magzine نے 1992 اور 1997 میں انڈسٹری کی 20 اہم شخصیتوں کی فہرست میں شامل کیا تھا۔ Perlman کو 2000 میں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری اور 2004 کے Silicon valley Inventor of the year کا ایوارڈ دیا گیا۔

کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی ماہر Dr. Anita Borg (1949-2003) نے کمپیوٹر سائنس میں نیویارک یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ اس کی ہمت افزائی کی بدولت بہت سی خواتین نے کمپیوٹر ٹیکنالوجی کو اپنے کیریئر کے طور پر منتخب کیا۔ 1987 میں اس نے Systers کے نام سے e-mail On-line Community قائم کی جس کی 3000 سے زیادہ خاتون اراکین ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ 1994 میں اس نے Grace Hopper Celeberation of Women in Computing Conference کے قیام میں کلیدی کردار نبھایا جس میں ساری دنیا سے کمپیوٹنگ کے لیے سب سے زیادہ خواتین جمع ہوتی ہیں۔ Anita نے 1997 میں ایک ادارہ Institute for Women & Technology کی بنیاد ڈالی۔ آج یہ ادارہ Anita Borg Institute for Women کے نام سے اس کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن ہے۔ Anita کو اپنی صلاحیتوں کو منوانے کے زندگی میں کئی مواقع ملے۔ سابق امریکی صدر بل کلنٹن نے 1999 میں خواتین کو سائنس، انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی میں بڑھاوا دینے کے لیے قائم کیے گئے کمیشن کے لیے اس کا تقرر کیا تھا۔ اس کو 2002 میں ٹیکنالوجی، معاشیات اور ایمپلائمنٹ کے لیے ہینز (Heinz) ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا۔

ماضی میں کمپیوٹر ہارڈ ویئر اور سافٹ ویئر کی ایجاد و اختراع میں کئی امریکی خواتین نے کارہائے نمایاں انجام دیا ہے جن کا تذکرہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔ دنیا کے پہلے عام مقصدی الکٹرانک کمپیوٹر ENIAC کے لیے 1940 میں پروگرام لکھنے والی ٹیم میں دو خواتین Adele katz اور Kathleen Mcnulty شامل تھیں۔ لیکن جب اس کمپیوٹر کا کام بہت زیادہ تخلیقی انداز کا ہو گیا تو ان کو علاحدہ کرکے ان کی جگہ مرد پرگرامر کو شامل کیا گیا تھا۔ ایک خاتون کمپیوٹر ڈیزائنر Evelyn Berezine (پیدائش 1925) نے ڈیجیٹل آن لائن پر Race-track Betting نظام کو اور دنیا کا پہلا Word Processor ڈیزائن کیا تھا۔ کمپیوٹر پروگرامر Ruth M. Davis (پیدائش 1928) نے دنیا کے پہلے ڈیجیٹل کمپیوٹر کی حیثیت سے تسلیم کیے گیے ' ORD - VAC SEAC اور UNIVAC-I کمپیوٹروں کے لیے پروگرام تیار کیا تھا۔ Lois M Haibt ایسی پروگرامر گزری ہے جو 1955 میں کمپیوٹر کی زبان FORTRAN تیار کرنے والوں میں شامل تھی۔ Grace Elizabeth Mitchel کو 1957 میں FORTRAN زبان کے پراجکٹ میں شامل کیا گیا تھا اور اس نے کمپیوٹر IBM 704 کو روبہ عمل لانے والا نظام ڈیزائن کیا تھا۔ کمپیوٹر پروگرامر Phyllis fox کا شمار ایسی خواتین میں ہوتا ہے جنھوں نے Intelligent language کو Develop کیا تھا۔ اس کے علاوہ Fox نے 1960 میں اس زبان کے لیے Official Programers Manual بھی تیار کیا تھا۔ کمپیوٹر کی ماہر ایک خاتون Patricia Weiner نے 1973 میں سلیکن کی ایک Chip پر کمپیوٹر کے لیے Memory کا پہلا نظام تیار کیا تھا۔ 1981 میں ایک فن کارہ Nancy Burson کمپیوٹر پروسیس اور ایک ایسے آلے کی ایجاد کو پیٹنٹ کروانے والوں میں شامل تھی جو کسی پورٹریٹ میں شخصیت کی عمر کو کم کرکے ظاہر کرنے میں استعمال ہوتا ہے۔ تب اس بات کی قوی امید کی جارہی تھی کہ یہ تکنیک مستقبل میں انسانی چہروں کی پلاسٹک سرجری میں معاون ثابت ہوگی۔

کمپیوٹر گرافکس کا شمار کمپیوٹر کے ایک بہت ہی رومان پرور اور دلکش شعبے میں ہوتا ہے۔ ابتدا میں اس میدان میں بہت کم خواتین اپنے فن کا مظاہرہ کیا کرتی تھیں لیکن آج سیکڑوں خواتین ایسی ملیں گی جنھوں نے نہ صرف کمپیوٹر گرافکس میں اپنا لوہا منوایا ہے بلکہ اعلیٰ عہدوں پر فائز بھی ہیں۔

19-2-27/A/1/1
Jahan Numa, Hyderabad-500053

□□□

اسد فیض

2005 کی اہم پاکستانی مطبوعات

کمپیوٹر کے اس دور میں بھی جب کہ ای. کتابوں کا رواج بڑھ رہا ہے اور اب انٹرنیٹ پر بھی اردو میں تنقیدی کتب اور افسانوی ادب دستیاب ہے، کتابوں کی اشاعت میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ زندہ معاشروں میں تخلیقی لفظ اور مطبوعہ کتاب کی اہمیت بہر طور موجود رہے گی۔

گذشتہ برس لاہور، کراچی، ملتان، راولپنڈی اور اسلام آباد جو کہ ملک میں ادب کے بڑے اور اہم مراکز ہیں، لاتعداد خوبصورت شعری مجموعے، ناول، افسانوی مجموعے اور تحقیقی کتب طبع ہوئیں۔ یہ کتابیں اپنے علاقوں کی نمائندگی بھی کرتی ہیں اور ان میں ان خطوں کے رسم رواج، ثقافت اور مسائل بھی موجود ہیں۔ پوری دنیا میں اس وقت فکشن زیادہ لکھا اور پڑھا جا رہا ہے اور شاعری کم ہو رہی ہے لیکن ہمارے ہاں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ گذشتہ برس ہندوستان اور پاکستان میں سجاد ظہیر اور ترقی پسند تحریک کے حوالے سے تقریبات ہوئیں اور چند کتب بھی شائع ہوئیں جو ترقی پسند تحریک کے احیا کی طرف ایک اہم پیش رفت قرار دی جا رہی ہے۔ گذشتہ برس کے سالانہ جائزے کی ابتدا خودنوشت سے کی جائے تو بہتر ہوگا۔ ڈاکٹر سلیم اختر افسانہ نگار اور ادبی تاریخ نگار بھی ہیں۔ وہ ایک طویل عرصے تک درس و تدریس سے بھی وابستہ رہے ہیں۔ اس برس ان کی خودنوشت ''نشانِ جگر سوختہ'' کے نام سے لاہور سے طبع ہوئی ہے۔ یہ اس سے قبل ''معاصر'' میں قسط وار شائع ہوتی رہی ہے۔ کتاب کو بارہ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جس میں ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنے بچپن سے عصر حاضر تک کے حالات و واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ کتاب خوبصورت چھپی ہے لیکن ایک کمی کا احساس ہوتا ہے کہ لاہور کی ادبی معرکہ آرائیوں کے بارے میں انھوں نے زیادہ کچھ لکھنے سے گریز کیا ہے حالاں کہ وہ اس کے عینی شاہد اور ایک اہم کردار بھی رہے تھے۔ کتاب کی ضخامت 277 صفحات ہے۔ دوسری کتاب عین۔ س۔ مسلم کی خودنوشت ''لمحہ بہ لمحہ زندگی'' ہے جو لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں انھوں نے اپنی زندگی کے واقعات کو اس فنکارانہ ہنرمندی سے پیش کیا ہے کہ یہ برصغیر کے مسلمانوں کی کہانی بن گئی ہے۔ ع۔ س۔ مسلم ایک طویل عرصہ خلیج کی ریاستوں میں بھی کاروبار کی غرض سے مقیم رہے ہیں۔ اس ناطے وہاں منعقد ہونے والی ادبی تقریبات اور مشاعروں کا انھوں نے جو نقشہ کھینچا ہے اور اس کے پس پردہ جو کہانیاں بیان کی ہیں وہ دلچسپ اور عبرت انگیز ہیں۔

''گلشن یاد'' آغا ناصر کی یادداشتوں، خاکوں اور سفرناموں پر مبنی کتاب ہے۔ ان کی اس سے قبل تین کتب طبع ہو چکی ہیں۔ وہ میڈیا سے وابستہ ہیں اور پاکستان کی ادبی اور ثقافتی تاریخ کے گواہ بھی، اس لحاظ سے یہ ایک دلچسپ کتاب ہے۔ ''طاق نسیاں'' شہزادہ فخر الملک فخر کی خودنوشت ہے۔ یہ ضلع چترال کی تاریخ و ثقافت کا مرقع ہے۔ انھوں نے چترال کے آخری شاہی خاندان کٹوریہ میں آنکھ کھولی۔ وہ ادیب اور شاعر بھی ہیں۔ یہ کتاب ان کی 1935 سے 2005 تک پھیلی ہوئی زندگی کا بیان ہے۔ کتاب اسلام آباد سے شائع ہوئی ہے۔

گذشتہ برس جو قابل ذکر افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ ان میں اہم خالدہ حسین کا افسانوی مجموعہ ''میں یہاں ہوں'' ہے۔ یہ لاہور سے طبع ہوا ہے۔ اس میں پندرہ افسانے اور تراجم شامل ہیں۔ اس سے پہلے ان کے چار افسانوی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ کتاب کی ضخامت 177 صفحات ہے۔ ''خالی ہاتھ''، اے خیام کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے جو فروری 2005 میں کراچی سے شائع ہوا ہے۔ اس میں پندرہ افسانے ہیں۔ اے خیام 1960 کی دہائی کے افسانہ نگاروں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اے خیام کے ابتدائی افسانے جدیدیت کے زیر اثر لکھے گئے۔ ''خالی ہاتھ'' میں انھوں نے اپنے اردگرد کی زندگی کو انتہائی مہارت سے کہانی کے قالب میں ڈھالا ہے کہ وہ یادگار افسانے بن گئے ہیں۔ ان میں وہی رنگ اور مہک ہے جو اردو افسانے کے اس یادگار دور کی یاد دلاتی ہے جسے منٹو اور بیدی کے دور سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ''لاوارث'' کے نام سے ایک اور اہم افسانوی مجموعہ لاہور سے شائع ہوا ہے۔ یہ ترقی پسند ادیبہ افضل توصیف کی تصنیف ہے۔ اس میں پندرہ افسانے اور ایک ناولٹ ''ٹوٹتی جڑتی آس کی ڈوری'' بھی شامل ہے۔ یہ زندگی کی حرارت اور بصیرت سے بھرپور کہانیاں ہیں جو متاثر کرتی ہیں۔ حامد سراج نے بہت کم عرصے میں اپنے منفرد افسانوں کے سبب اردو افسانے میں ایک مقام بنایا ہے۔ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ گذشتہ برس ''برائے فروخت'' کے نام سے فیصل آباد سے شائع ہوا۔ اس میں انیس افسانے ہیں۔ کتاب کی ضخامت 140 صفحات ہے۔ افسانے سے ان کے کمٹ منٹ کا یہ عالم ہے کہ ابتدا میں انھوں نے لکھا ہے کہ جس روز میں لکھنا چھوڑ دوں گا اس روز مر جاؤں گا۔ ''سلسلۂ روز و شب'' جرمنی میں مقیم نیر اقبال علوی کا تیسرا افسانوی مجموعہ ہے

جو لاہور سے طبع ہوا ہے۔ اس میں سولہ افسانے ہیں۔ ڈاکٹر سعادت سعید نے دیباچے میں لکھا ہے کہ نیر اقبال کا قلم اپنے عہد کے بھیانک ترین ذاتی نفسیاتی، اجتماعی، اخلاقی، بین الاقوامی، سیاسی اور مستور سماجی جرائم اور مظالم قارئین کے سامنے لانے سے گریزاں نہیں۔

ڈاکٹر انور نسیم کی ایک کتاب ''وہ قربتیں یہ فاصلے'' پنڈی سے طبع ہوئی ہے۔ کتاب میں ڈاکٹر انور نسیم کا ایک دلچسپ اور معلوماتی انٹرویو بھی شامل ہے۔ لیہ کے نوجوان افسانہ نگار احمد اعجاز بھلر کا پہلا افسانوی مجموعہ لاہور سے طبع ہوا ہے۔ اس میں بارہ افسانے شامل ہیں۔ مئی 2005 میں جاوید اختر پاشا کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''صحرا سمندر'' کراچی سے طبع ہوا ہے۔ اس میں اٹھارہ افسانے شامل ہیں۔ ابتدا میں ان کے افسانوں کے بارے میں میرزا ادیب، سید ضمیر جعفری، منشایاد، ڈاکٹر اعجاز راہی کی آرا اور مضامین بھی شامل اشاعت ہیں۔ انھوں نے پاکستانی تہذیب و ثقافت کے علاوہ بین الاقوامی موضوعات پر بھی اثر انگیز افسانے لکھے ہیں۔ ''دھند میں راستہ'' لبابہ عباس کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ ہے جو اسلام آباد سے شائع ہوا ہے۔ اس میں خانگی مسائل پر بیس کہانیاں ہیں۔ ''کہکشاں'' کے نام سے خالدہ انور کے افسانے لاہور سے شائع ہوئے ہیں۔ اس مجموعے میں چار طویل افسانے ہیں۔ مرزا حامد بیگ کا افسانوی مجموعہ ''تار پر چلنے والی'' جس میں ایک ناولٹ بھی شامل ہے، 2005 میں اسلام آباد سے اس کی مکرر اشاعت ہوئی ہے۔ گذشتہ برس غیر ملکی افسانوں کے تراجم پر مبنی قابل قدر مجموعے بھی منظر عام پر آئے۔ قیصر سلیم فکشن نگار ہیں اور کراچی میں مقیم ہیں۔ ان کے سات ناول اور ایک افسانوی مجموعہ اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی تازہ کتاب تراجم کا ایک مجموعہ ہے جو ''منتخب عالمی افسانے'' کے عنوان سے کراچی سے منظر عام پر آیا ہے۔ اس میں 34 ممالک کے 43 افسانے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ تراجم اس محنت اور سلیقے سے کیے گئے ہیں کہ ان پر طبع زاد ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ ''جھمکاتا'' کے نام سے بنگالی افسانہ نگار معین الدین کی تیرہ کہانیوں کا اردو ترجمہ رفیع احمد فدائی نے کیا ہے۔ اس مجموعہ کو ہمایوں ظفر نے مدون کیا ہے اور یہ کراچی سے شائع ہوا ہے۔ راجہ تری ویو رائے کے افسانوں کا اردو ترجمہ اے۔ڈی۔ میکن نے کیا ہے۔ یہ کتاب اسلام آباد سے شائع ہوئی ہے۔

گذشتہ برس ناول کم منظر عام پر آئے۔ 2005 میں جو گنے چنے ناول چھپے ان میں مستنصر حسین تارڑ کا ناول ''ڈاکیا اور جولاہا'' ایک غیر معمولی تخلیقی کاوش ہے۔ یہ ایک ایسے مسافر کی کہانی ہے جو ایک پہاڑی راستے پر سفر کے دوران ایک ڈاکیے سے پوچھتا ہے کہ اس کے نام کوئی خط تو نہیں ہے پھر خود سوچتا ہے کہ کسی کو کیسے پتہ ہوگا کہ میں کبھی ادھر سے گزروں گا۔ مستنصر نے اس ناول سے اپنے آپ کو بہ حیثیت ناول نگار مزید مستحکم کر لیا ہے۔

''جیون مایا'' کے نام سے فاریہ الماس کا ایک ناول لاہور سے طبع ہوا ہے۔ اس سے قبل ان کا ایک افسانوی مجموعہ بھی طبع ہو چکا ہے۔ ناول کا موضوع درمیانہ طبقے کے معاشی مسائل، طبقاتی کشمکش اور محبت ہیں۔ لاہور سے ایک اور ناول عرفان احمد خاں کا ''مدہوش'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ لاہور سے ہی م ش۔ آشفتہ کا ایک ناول ''تقدیر کہاں لے آئی'' منصۂ شہود پر آیا ہے۔ آشفتہ اس سے قبل بھی ناول لکھ چکے ہیں۔ اس ناول کا موضوع عوام کی محرومیاں اور کرپٹ سیاسی ماحول ہے۔ جو ہماری ترقی کی راہ کی بڑی رکاوٹ ہے۔ پہاڑ کے نام سے ملک خدا بخش ساجد کا ایک ناول اسلام آباد سے شائع ہوا ہے۔ انھوں نے اس میں پاکستانی معاشرت میں غیر جمہوری رویوں اور غیر انسانی تصورات کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ناول کا لینڈ اسکیپ پوٹھوہار کی وادی سون سکیسر کی دیہاتی زندگی سے متعلق ہے۔ مصنف کے اس سے قبل دو ناول شائع ہو چکے ہیں۔

تنقید و تحقیق کے ذیل میں گذشتہ برس جو کتب شائع ہوئیں ان میں بے حد موضوعاتی تنوع اور رنگا رنگی موجود ہے۔ اپنے عہد کے بے مثال شاعر حبیب جالب کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ان کے فکر و فن پر ایک ضخیم کتاب ''میں طلوع ہو رہا ہوں'' کراچی سے ان کے بھائی سعید پرویز نے مرتب کر کے شائع کی ہے۔ اس میں حبیب جالب پر مضامین، شاعری اور انگریزی مضامین بھی شامل اشاعت کیے گئے ہیں۔ کراچی سے ہی سید جعفر احمد نے ترقی پسند ادیب سجاد ظہیر کے فکر و فن پر مضامین کا مجموعہ ''سجاد ظہیر۔ شخصیت، فکر'' مرتب کی ہے۔ انھوں نے سبط حسن کی سجاد ظہیر پر ایک کتاب ''مغنی آتش نفس سجاد ظہیر'' کو بھی مدون کیا ہے۔ ڈاکٹر طاہر تونسوی ادیب و شاعر ہیں۔ گذشتہ برس ان کے بارے میں دو کتب شائع ہوئیں۔ پہلی کتاب شہزاد بیگ کی ''ڈاکٹر طاہر تونسوی ایک مطالعہ'' ہے۔ یہ فیصل آباد سے طبع ہوئی۔ اس میں چھ سو سے زائد صفحات میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کے فکر و فن پر لکھے گئے مضامین کو مرتب کیا گیا ہے۔ دوسری کتاب اعتبار حرف ہے جسے اسد فیض نے مرتب کیا ہے اس میں ڈاکٹر طاہر تونسوی کے تنقیدی و تحقیقی مضامین کا انتخاب شائع کیا گیا ہے۔ فتح محمد ملک کی ایک کتاب ''سعادت حسن منٹو ایک نئی تعبیر'' گذشتہ برس شائع ہوئی۔ اس میں انھوں نے منٹو کی شخصیت اور فن کو ایک نئے رخ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انگارے اردو افسانے کی تاریخ میں منفرد حیثیت کا حامل مجموعہ ہے۔ یہ کافی عرصے سے کمیاب ہے۔ ہندوستان میں اس کا متن اور افسانوں پر تجزیہ بھی چند برس قبل چھپ چکا ہے۔ لاہور سے ڈاکٹر محمد کامران نے ''انگارے ــ تحقیق و تنقید'' کے عنوان سے

چار ابواب میں اس کے افسانوں کا فکری اور فنی جائزہ لیا ہے اور اردو افسانے پر اس کے اثرات پر بھی بحث کی ہے۔ تنقید اور ادب کے نظری مباحث پر ایک کتاب ''جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک۔ فکریات و تناظرات'' کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ اسے شفیق احمد شفیق نے تحریر کیا ہے۔ دنیا کے بدلتے حالات کے ساتھ تنقید اور ادب کے نئے سوالات سامنے آتے رہتے ہیں۔ ایک نقاد کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ادب پر ان کے اطلاق و اثرات کا جائزہ لے۔ شفیق احمد شفیق نے ادب، ادیب اور آفاقیت، خرد افروزی کی روایت اور مابعد جدیدیت جیسے موضوعات پر اس کتاب میں اظہار خیال کیا ہے۔ کتاب کی ضخامت 144 صفحات ہے۔ نظیر صدیقی شاعر اور نقاد تھے۔ وہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ تھے۔ ''حرف تازہ بیاد نظیر صدیقی'' دراصل یادنگاری کی ایک صورت ہے جسے فرحت پروین ملک اور احمد زین الدین نے مرتب کیا ہے۔ اس میں نظیر صدیقی کے فکر و فن پر ملک کی نمایاں ادبی شخصیتوں کے مقالات، منظومات، مکاتیب اور تاثرات کو جمع کیا گیا ہے۔ یہ کتاب نظیر صدیقی کی ادبی شخصیت کا ایک ایسا آئینہ ہے جس میں ان کی ادبی صلاحیتوں کے بہت سے زاویے نمایاں ہوتے ہیں۔ ''تصریحات'' ڈاکٹر سید شبیہ الحسن کے منفرد انداز میں تحریر کیے گئے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو لاہور سے شائع ہوا ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے معاصر ادب کی مختلف شخصیات کو موضوع بنایا ہے اور جن شخصیات کو نقد و نظر کے لیے منتخب کیا ہے وہ اپنے اپنے میدان میں بے مثال اور یکتا ہیں مثلاً آغا سہیل، طاہر تونسوی، فخر الحق نوری، اشفاق حسین، ڈاکٹر سید معین الرحمن۔ ڈاکٹر صدیق جاوید کی کتاب ''تحقیق کے چراغ تلے'' فیصل آباد سے طبع ہوئی ہے۔ دیباچہ ڈاکٹر انور محمود خالد نے لکھا ہے۔ تحقیق کے حوالے سے ایک اہم کتاب ''محاورات آتش'' ملتان سے شائع ہوئی ہے۔ جسے ڈاکٹر عبدالغفار کوکب نے مرتب کیا ہے۔ اس میں الف بائی ترتیب سے کلام آتش کے اشعار سے محاورات منتخب کر کے ان کی لغت تیار کی گئی ہے۔ غالب اور میر کے مقابل آتش کے کلام میں بھی بے پناہ شعری خوبیاں ہیں لیکن اس پر ناقدین نے توجہ نہیں کی۔ عبدالغفار کوکب کی یہ کاوش لائق تحسین ہے۔ غالب پر لغات غالب اور میر پر فرہنگ میر ہندوستان سے چھپ چکی ہیں لیکن آتش پر اس نوعیت کا کام دونوں ممالک میں نہیں ہوا ہے۔ جامعات اور سرکاری اداروں کو اس نوعیت کے تحقیقی کاموں کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے۔ صوفی تبسم بیسویں صدی کی ایک اہم علمی ادبی شخصیت تھے۔ ڈاکٹر نثار احمد قریشی نے ان پر ڈاکٹریٹ کا مقالہ لکھا تھا۔ باقیات صوفی صاحب کے طور پر انھوں نے ''اردو اور تدریس اردو'' کے نام سے ان کے اردو گرامر سے متعلق اور دوسرے مضامین مرتب کیے ہیں۔ مقتدرہ قومی زبان نے اسے اسلام آباد سے شائع کیا ہے۔ اصلاح زبان کے حوالے سے ان مضامین کی بے حد افادیت ہے۔ تحقیق میں اشاریہ کو بھی بے حد اہمیت حاصل ہے۔ عبدالعزیز ساحر نے ماہر اقبالیات اور ادیب ''ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سوانح اور کتابیات'' کے عنوان سے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی زندگی اور علمی ادبی کاموں کا اشاریہ بنایا ہے۔ کتاب کی ضخامت 126 صفحات ہے اور یہ اٹک سے شائع ہوئی ہے۔ جامعات میں ڈاکٹریٹ کے لیے لکھے گئے دو مقالات بھی گذشتہ برس طبع ہوئے۔ پہلے مقالے پر ملتان یونیورسٹی نے ڈاکٹر عقیلہ جاوید کو ''اردو ناول میں عورت کا تصور'' کے عنوان سے 2001 میں پی ایچ.ڈی. اردو کی ڈگری ایوارڈ کی تھی۔ اب شعبۂ اردو نے ازخود یہ مقالہ شائع کیا ہے۔ دوسرا مقالہ ''شوکت صدیقی فن و شخصیت'' پر کراچی یونیورسٹی نے مریم حسین کو 2003 میں پی ایچ.ڈی. کی ڈگری عطا کی۔ یہ مقالہ بھی کراچی سے طبع ہوا ہے۔ اردو شاعری میں گذشتہ برس کلیات کی اشاعت کا رجحان حاوی رہا۔ اس سلسلے میں کلاسکی شعرا کے کلام کی اشاعت کا اہتمام ایک خوش آئند کوشش قرار دی جاسکتی ہے۔ مثلاً حیدر علی آتش کا مکمل دیوان لاہور سے شمیلہ ستار نے مرتب کیا ہے۔ اس سے قبل مجلس ترقی ادب لاہور کا شائع کردہ کلیات نایاب ہے لیکن مذکورہ دیوان میں بے پناہ متن کی غلطیاں موجود ہیں جس نے اس کلیات کی اشاعت کو متنازعہ بنا دیا ہے۔

لاہور سے حفیظ جالندھری کا کلیات بھی طبع ہوا ہے۔ اسے خواجہ محمد زکریا نے مرتب کیا ہے۔ اس میں حفیظ جالندھری کے چاروں شعری مجموعے شامل ہیں۔ محسن نقوی غزل اور مرثیے کے شاعر تھے۔ پندرہ سو صفحات پر مبنی ان کا کلیات گذشتہ برس لاہور سے طبع ہوا۔ اس میں ان کے آٹھ شعری مجموعے شامل ہیں۔ معروف شاعر ظفر اقبال کا کلیات بھی دو جلدوں میں طبع ہوا ہے۔ افتخار عارف کا تیسرا شعری مجموعہ ''جہان معلوم'' کراچی سے طبع ہوا ہے۔ یہ ان کے باطنی سفر کا اظہاریہ ہے۔ افتخار عارف کا شعری سفر مسلسل ارتقا پزیر رہا ہے۔ اردو غزل میں اب ان کا اسلوب اور موضوعات ان کی پہچان ہیں۔

افتخار عارف کے دوسرے مجموعے ''حرف باریاب'' کا بھی گذشتہ برس ساتواں ایڈیشن شائع ہوا۔ کراچی سے ان کے سلام اور منقبت کا ایک انتخاب بھی شائع ہوا ہے۔ ادیب سہیل محقق، شاعر اور ادیب ہیں۔ ان کی منظومات ایک عرصے سے ہندو پاک کے ادبی جرائد میں چھپ رہی ہیں جس کا انتخاب جنوری 2005 میں ''کچھ ایسی نظمیں ہوتی ہیں'' کے عنوان سے کراچی سے طبع ہوا ہے۔ وہ اس سے پہلے ''بکھراؤ کا حرف آخر'' کے عنوان سے سانحۂ مشرقی پاکستان اور ''غم زمانہ بھی سہل گزرا'' کے عنوان سے اپنی منظوم خودنوشت رقم کر چکے ہیں۔ ان نظموں کے موضوعات زندگی کی تلخ حقیقتوں کے ترجمان

ہیں۔ معاصر سیاسی حالات وواقعات کا تجزیہ بھی ان نظموں میں ملتا ہے۔

''لکھتے رہے جنوں'' کے عنوان سے پروفیسر زاہد نوید کی غزلوں کا مجموعہ اسلام آباد سے طبع ہوا ہے۔ کتاب کا فلیپ احمد ندیم قاسمی نے لکھا ہے۔

اختر شمار کی غزلوں کا مجموعہ ''دھیان'' کے نام سے لاہور سے شائع ہوا ہے۔ غزلوں کے موضوعات غم زمانہ اور عشق کی واردات ہیں۔ رضی مجتبیٰ کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ''اجالوں کی اوٹ'' کے نام سے کراچی سے شائع ہوا ہے۔ نظموں کے موضوعات زیادہ تر سیاسی ہیں۔ اس کی ضخامت 270 صفحات ہے۔ ظہور ناظم کا شعری مجموعہ ''بہت امید سحر تھی'' لاہور سے شائع ہوا ہے۔ ان کی غزلوں میں عصری، سیاسی اور سماجی رویے بہت خوبصورتی سے منعکس ہوئے ہیں۔

''نیند کی نوٹ بک'' منصور آفاق کا غزلیات کا مجموعہ ہے جو لاہور سے طبع ہوا ہے۔ نیند کی نوٹ بک روایت سے انحراف کی ایک کوشش ہے۔ ابتدا میں دیباچہ کی بجائے ساقی فاروقی سے قلم کلامی ایک خوبصورت اور دلچسپ تحریر ہے۔ منصور کی لفظیات نئی ہے۔ وہ برمنگھم میں رہتے ہوئے بھی ذہنی طور پر میاں والی میں ہی رہتا بستا ہے۔ لیکن انگریزی لفظوں کو اس نے خوبصورتی سے اردو اشعار میں پیوند کیا ہے۔ کتاب کی ضخامت 256 صفحات ہے۔ اختر عثمان کی غزلیات کا مجموعہ ''کچھ بچا لائے ہیں'' جنوری 2005 میں راولپنڈی سے شائع ہوا ہے۔ غزلیات میں انفرادیت کا رنگ اور حوصلہ مندی کا لہجہ موجود ہے۔ کتاب کی ضخامت 144 صفحات ہے۔

انور مسعود کا شعری مجموعہ ''درپیش'' اسلام آباد سے طبع ہوا ہے، دیباچہ اسلم انصاری نے رقم کیا ہے۔ دو اشعار ملاحظہ ہوں۔ انور مسعود کا خاص رنگ اس میں جھلکتا ہے۔ اسد جعفری کی منظومات ''تیرا ہنسنا قیامت ہے'' کے عنوان سے لاہور سے شائع ہوئی ہیں۔ ''باب فضیلت'' کے عنوان سے خرم خلیق کا شعری مجموعہ منظر عام پر آیا ہے۔ اختر ہوشیار پوری کی غزلیات کا دوسرا مجموعہ ''گئی رات کے خواب کے بعد آئینوں کے ساتھ'' کے نام سے پنڈی سے شائع ہوا ہے۔ تسنیم سحر کی غزلیات کا مجموعہ ''خواب سب سے الگ'' لاہور سے شائع ہوا ہے۔ 216 صفحات کی ضخامت میں نئی لفظیات پر مبنی شاعری ایک الگ ذائقے کی حامل ہے۔

متفرق کتب میں ''رتی گلی'' کے نام سے مستنصر حسین تارڑ کا وادی کاغان اور آزاد کشمیر کا سفرنامہ لاہور سے شائع ہوا ہے۔ مصنف نے ان راستوں پر 1956 میں کالج کی طرف سے بطور طالب علم سفر کیا تھا لیکن اب 2003 میں ایک سیاح کے طور پر ان علاقوں کا سفر اختیار کیا۔ مستنصر کے خاص اسلوب میں رچا بسا یہ ایک دلچسپ سفرنامہ ہے۔ مشتاق احمد یوسفی کے انداز میں مزاح تحریر کرنے میں ڈاکٹر یونس بٹ اپنا ثانی نہیں رکھتے، گذشتہ برس ان کی مزاحیہ تحریروں پر مبنی کتاب ''بٹ کاریاں'' لاہور سے شائع ہوئی۔ اس کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ہم اب سماجی اور سیاسی سطح پر ایک دوسرے پر ہنسنے کے متحمل ہو سکتے ہیں اور ہماری قوت برداشت میں اضافہ ہوا ہے۔ ''مسافر شہر نو'' کے نام سے مرحوم سید ضمیر جعفری کی ڈائری اسلام آباد سے شائع ہوئی ہے۔ ضمیر جعفری کے ادبی اور طنز ومزاح پر مبنی اسلوب نے کتاب کی اہمیت میں اضافہ کیا ہے۔ اقبالیات کے حوالے سے ایک اہم کتاب ''اقبال اور عصری مسائل'' ڈاکٹر کنیز فاطمہ یوسف نے تحریر کی ہے۔ کتاب کا دیباچہ حنیف رامے نے تحریر کیا ہے۔ بارہ ابواب میں اقبال کے افکار ونظریات کا جائزہ پاکستان اور عالم اسلام کے تناظر میں لیا گیا ہے۔ اقرار حسین شیخ کی ایک مختصر کتاب ''علامہ اقبال کی کہانی'' لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں حیات اقبال، علامہ اقبال کی تخلیقی سیاسی سرگرمیوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ برصغیر کی عظیم ادبی شخصیتوں سے ملاقاتوں پر مبنی احمد سلیم کی کتاب ''ملاقاتوں کے بعد'' اسلام آباد سے شائع ہوئی ہے۔ اس میں فیض، کیفی اعظمی، شیخ ایاز، استاد دامن، احمد راہی اور مسعود کھدر پوش سے ملاقاتوں کا احوال رقم کیا گیا ہے۔ یہ ''خبر گرم'' اظہر سلیم مجوکہ کے کالموں کا مجموعہ ہے جو معاشرتی اور سیاسی واقعات پر بھرپور تجزیہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کراچی سے ''لیل ونہار'' کے نام سے سلیم کاشمیری کے ایک ہفت روزہ میں مکتوب متحدہ عرب امارات کے نام سے چھپنے والے کالم مجتمع صورت میں شائع کیے گئے ہیں۔ اس میں متحدہ عرب امارات کی ادبی سرگرمیوں کا احوال بھی موجود ہے۔ تراجم کے ذیل میں گذشتہ برس ایڈورڈ سعید (1935-2003) کی مشہور کتاب ''اورینٹلزم'' کا اردو ترجمہ محمد عباس نے ''شرق شناسی'' کے عنوان سے کیا ہے۔ کتاب مقتدرہ قومی زبان کے زیر اہتمام بڑے سائز میں شائع کی گئی ہے۔ حمید اختر ترقی پسند ادب کا ایک اہم نام ہے۔ ان کے اخباری کالموں کا مجموعہ ''احوال واقعی'' لاہور سے طبع ہوا ہے۔ ان کالموں کے زیادہ تر موضوعات ادبی ہیں۔ کتاب کی ضخامت 504 صفحات ہے۔ ارشادات وافادات (جلد دوم) کے نام سے ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی کے خطوط کا مجموعہ کراچی سے منصۂ شہود پر آیا ہے۔ اس میں چودہ ادیبوں کے خطوط اور ان کا تعارف شائع کیا گیا ہے۔ خطوط کے موضوعات اور مباحث زیادہ تر ادب سے متعلق ہیں۔

گذشتہ برس کی کتابوں کا یہ جائزہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ کتابیں خاصی تعداد میں چھپ رہی ہیں لیکن کتب فروشوں کا یہ موقف ہے کہ فروخت کم ہوتی ہیں۔ اس کا ایک بڑا سبب کتابوں کی ہوشربا قیمتیں ہیں۔ حکومت کا یہ فرض ہے کہ مزید سرکاری سطح پر اشاعتی ادارے قائم کرے، ناشرین کی معاونت کرے اور مختلف شہروں میں کتب خانے قائم کرے تاکہ عوام میں لکھنے پڑھنے کا ذوق برقرار رہے۔ اس لیے کہ کتب سے رواداری، امن اور محبت کو فروغ ملتا ہے۔

□□□

اقبال محی الدین

سمندری طوفان: نوعیت اور اسباب

ہمارے اس سیارے کو زمین کہنا ایک لحاظ سے درست نہیں بلکہ کئی سائنس دانوں نے تو اسے "آبی سیارہ" (Watery Planet) بھی کہا ہے۔ محض اس لیے نہیں کہ سطح زمین کا 71 فیصد حصہ پانی سے ڈھکا ہوا ہے بلکہ اس کرۂ ارض پر پانی کی کثیر مقدار میں موجودگی اس سیارے کی ایک ایسی بے نظیر خصوصیت ہے جو نظام شمسی کے کسی سیارے میں موجود نہیں۔ ہمارے سیارے کی ایک اور نادر خصوصیت یعنی اس پر حیاتیات کی موجودگی ہے۔

سمندروں میں بے شمار راز پنہاں ہیں۔ چنانچہ ایک سمندر کے طاس میں بھی کرہ ارض پر پائے جانے والے تقریباً تمام اہم ارضی خط و خال کی کئی ہیئتیں ہوتی ہیں۔ جیسے پہاڑ، ان کی ڈھلاندار چوٹیاں، سطح مرتفع، مسطح میدان، ناندیا کونڈے، درۂ آب وغیرہ۔ دراصل یہ زیر آب پر سکون خط و خال اپنے براعظمی ترائیوں، ڈھلوانوں، اتھاہ گہرائی کے میدانوں اور گہری خلیجوں کے ساتھ اپنی کوہ پیا جسامت وضخامت کے ساتھ نہایت مہیب نظر آتے ہیں۔

یہ سمندر ساحلوں کو تراش دیتے ہیں، آب و ہوا کو متبدل، مچھلیوں اور دیگر بحری جانداروں کی پرورش اور معدنیات خصوصاً نمک کا ذخیرہ کرتے ہیں۔ ان سمندروں نے ہمارے اس سیارے پر پیدا ہونے والے کچھ ازلی جانداروں کا ان کی ابتدائی ہیئت میں تاحال تحفظ کیا ہے۔ یہ سمندر بحری جانداروں کے ایک گہوارہ ثابت ہوتا ہے۔ ایک ایسا گہوارہ جو سادہ مگر بے مثال ہے۔ سمندروں میں حرارت کو جمع کرنے کی غیر معمولی استعداد پائی جاتی ہے جس کے نتیجے کے طور پر وہ حرارت کے بڑے ذخائر کو جمع کرنے کا کام انجام دیتے ہیں اور جس کی وجہ سے موسم گرما کی تپش اور شدید موسم سرما کو معتدل کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ زمین پر پہنچنے والی سورج کی کل توانائی کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ سمندر کے پانی کی تبخیر میں صرف ہوتا ہے جس کی وجہ سے ہر سال تین لاکھ تیس ہزار مربع کلومیٹر سمندر کا پانی کرۂ باد میں منتقل ہو جاتا ہے اور تعطیر کی صورت میں زمین سے ہوتا ہوا سمندر میں پھر واپس چلا جاتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ سورج، کرۂ باد اور کرۂ آب مل کر موسم کی دیوہیکل مشین کو ترتیب دیتے ہیں۔

سمندر کے پانی میں ہمیشہ ہلچل رہتی ہے کیونکہ بے سکونی تو سمندر کی بنیادی خصوصیات میں سے ایک ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں جیسے پانی کے درجات تپش و کثافت میں فرق، زمین کی گردش کے اثرات، ہوا کے بہاؤ کی سمت، سورج چاند کی کشش ثقل سمندر کے پانی کو مسلسل حرکت میں رکھتے ہیں اور اس طرح اس میں لہریں، دھارے اور مد و جزر آتے رہتے ہیں۔

سمندروں کی ان مثبت خصوصیات کے علاوہ کچھ منفی پہلو بھی ہیں یعنی سمندروں کا غیض و غضب جس کو سمندری طوفان کہتے ہیں۔ سمندری طوفان بیحد تباہ کن ہوتا ہے جو ہزاروں، لاکھوں جانوں، مکانوں اور نباتات کو نیست و نابود کر دیتا ہے۔

یوں تو سمندری طوفان کے آنے کی بہت ساری وجوہات ہیں جن میں ہوائی دباؤ (Low Air Pressure) زیادہ اہمیت کا حامل ہے جس سے سائیکلون (Cyclone) وجود میں آتے ہیں۔ ان سے شدید اور تباہ کن کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ان سمندری طوفانوں کو دنیا میں مختلف ناموں سے جانا جاتا ہے۔ کریبین (Caribbean) اور بحرالکاہل (Pacific Ocean) کے ساحل سے کچھ دور میکسیکو میں انھیں سمندری طوفان یا Hurricane کہا جاتا ہے۔ اسی طرح چین، فلپائن اور جاپان کے سمندروں میں انھیں طیفون یا Typhoon کہا جاتا ہے۔ بحر ہند میں انھیں Cyclone کہا جاتا ہے جبکہ شمالی آسٹریلیا کے آس پاس ولی ولیز (Willy Willies) کے نام سے مشہور ہے اور امریکہ میں انھیں Tornado کے نام سے جانا جاتا ہے۔

منطقہ حارہ سائیکلون (Tropical Cyclone) کی خاص طور سے منطقہ حارہ کے سمندروں میں ابتدا ہوئی ہے جہاں کہ سطح سمندر کی تپش نہایت شدید ہوتی ہے اور پھر ان علاقوں کے ہوائی تودوں (Air Masses) کی شرح استعداد میں عموماً اتار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ غیر مستقل ہوتے ہیں اور ان میں ایصالی عمل زیادہ ہوتا ہے۔

یہ سائیکلون عموماً اپنی راہ میں حائل جزیروں اور ساحلی علاقوں کی بستیوں کو پوری طرح تباہ و برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اکثر و بیشتر ایسے سائیکلون موسم گرما اور پت جھڑ کے آخری مہینوں میں ہندستان کے ساحلوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں اور تباہی مچاتے ہیں لیکن اب جدید سائنسی تکنیک و آلات، راڈار (Radar) اور موسم کی خبر دینے والے مصنوعی سیاروں (Satellites) کی مدد سے ایسے سائیکلون کی ابتدا اور ان کے راستوں کو ان کی ابتدا سے قبل ہی معلوم کرنا ممکن ہو گیا ہے جن کی مدد سے ملاحوں اور ساحلی علاقوں میں رہائش پذیر باشندوں کو بروقت مطلع کیا جا سکتا ہے تاکہ وہ

پیشگی احتیاط اختیار کر سکیں۔

سنامی لہریں بھی سمندری طوفانوں کو پیدا کرنے میں بہت اہم رول ادا کرتی ہیں جو بے حد تباہی کا باعث بنتی ہیں۔ سنامی جاپانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں ہاربر ویوز (Harbour Waves)۔ زلزلہ، آتش فشانی دھماکہ، سمندر کے نیچے ارضی حرکت، کائناتی وجود یعنی Cosmic Body جیسے حجر شہابی، لینڈ سلائیڈ وغیرہ سنامی کو پیدا کرنے والے اہم اسباب ہیں۔

یوں تو دنیا میں سنامی لہریں سے سمندری طوفان بہت آتے رہتے ہیں اور تباہی کا باعث بنتے ہیں مگر سنامی نے 26دسمبر 2004 کو سب سے زیادہ ہونے والی تباہی سے 9 ممالک کو دوچار کیا جس میں دو لاکھ بیس ہزار سے زیادہ لوگ مارے گئے۔ ہزاروں لاپتہ اور لاکھوں لوگ بے گھر ہو گئے اور اربوں روپیوں کا مالی نقصان ہوا۔ اب اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ لوگوں کی بازآبادکاری کے ساتھ ساتھ سنامی کے خطرے سے پیشتر آگاہ کرنے والی تکنیک کو ترقی یافتہ یا اسے زیادہ جانکاری رکھنے والے ممالک جیسے جاپان اور امریکہ سے حاصل کیا جائے۔ 26دسمبر 2004 کی سنامی یا سمندری طوفان کا جائے وقوع(Epicentre) انڈونیشیا میں باندا ایچ اور سماترا کے جنوب و مغرب میں 257 کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ رکٹر پیمانے پر اس کی ناپ 8.9 تھی۔

زلزلے کے بعد یا کسی اور وجہ سے سطح سمندر پر دائرے یکے بعد دیگرے ابھرتے ہیں اور یہ دائرے لہروں کی شکل میں بڑے ہوتے جاتے ہیں۔ جیسے پانی بھرے تالاب میں پتھر پھینکنے کی وجہ سے پانی میں دائرے بن کر پھیلتے چلے جاتے ہیں ویسے ہی سنامی لہریں متواتر عمودی ریل کی طرح آگے کھلے سمندر میں لمبے فاصلے تک بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ گہرے سمندر میں لہروں کی لمبائی بہت زیادہ (تقریباً 100 سے 200 کلومیٹر) اور لہروں کی اونچائی بہت ہی کم ہوتی ہے یعنی 0.3 سے 0.6 میٹر (1-2 فٹ)۔ لہر کی بننے والی ڈھلان (Trough) یا اونچائی (Crest) اور لمبائی کا تناسب 3/200.0000 اور 6/1000.000 کے درمیان میں ہوتا ہے۔ یہ بہت ہی کم ڈھلان والی لہریں بہت لمبے وقت کے ساتھ آگے بڑھتی ہیں۔ یہ وقفہ 5 منٹ سے ایک گھنٹہ تک ہوتا ہے۔ گہرے سمندر میں ان میں جوش نہیں ہوتا ہے اور وہ بے ضرر بھی ہوتی ہیں۔

سنامی لہریں جیسے ہی براعظمی ساحل کی طرف بڑھتی ہیں سمندری تہہ کے بڑھتے ہوئے اتھلے پن سے مزاحمت لہروں کی رفتار کو گھٹا دیتی ہے۔ اس میں مدت مستقلہ (Constant) ہونا چاہیے۔ نتیجتاً جیسے ہی رفتار گھٹتی ہے ویسے ہی لہروں کی لمبائی گھٹتی چلی جاتی ہے اور لہروں کی اونچائی بڑھتی جاتی ہے۔ ساحلی پانی دس سے پندرہ منٹ کے اندر 30 میٹر (100فٹ) تک اونچا اٹھ جاتا ہے۔ آسان زبان میں اس طریقہ کار کو اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں سمندری پانی کی سطح اٹھنے کے بعد ہی براعظمی شیلف (Continental Shelf) کا پانی اہتزاز(Oscillation) کرنا شروع کرتا ہے۔ دو تین بڑے اہتزاز ہی زیادہ تر نقصان کا سبب بن جاتے ہیں اور کچھ بھی کریں یہ شروع ہونے کے کچھ دن بعد ہی تھمتے ہیں۔

ساحل کے قریب زیر آب تہہ کی وضع(Topography) اور ساحلی ہیئت (Configuration) سے دوسری لہروں کی طرح سنامی بھی منعکس (Reflect) اور منعطف (React) ہوتی ہیں۔ اس لیے سنامی کے تباہ کن اثرات مختلف جگہوں پر مختلف ہوتے ہیں۔ کم ہی موقعوں پر سنامی کی پہلی لہر ساحل پر نشیب موج (Trough) ہوتی ہے اور اس میں پانی گھٹ جاتا ہے اور اتھلی سمندری تہہ کو اجاگر کر دیتا ہے۔ ایسا ہی واقعہ 1755 میں لزبن میں پیش آیا۔ کچھ آدمیوں کا تجسس ان کو خلیجی تہہ کی طرف کھینچ لایا اور بعد کی آنے والی لہر کی سطح (Crest) نے ان میں سے زیادہ تر کو چند منٹوں میں ڈبو دیا۔ حالانکہ ان لہروں کا ظہور کم ہی ہوتا ہے لیکن جب بھی ایسی لہریں ظہور پذیر ہوتی ہیں تو زبردست جانی اور مالی نقصان کا باعث بنتی ہیں۔

26دسمبر 2004 کو آنے والی سنامی یا سمندری طوفان کی وجہ ہندوستان اور برما پلیٹوں کا آپس میں رگڑنا تھا۔ اس کے لیے ساختمانی (Tectonic Plates) کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ یہ نظریہ یہ باور کراتا ہے کہ صرف براعظم ہی حرکت میں نہیں ہے۔ بحر اعظم بھی ان ہی کی طرح حرکت میں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین کے اوپری سطح بیسالٹ اور گرینائٹ کا مکمل ایک جیسا خول نہیں ہے۔ یہ خول مختلف طرح کے بہت سے ٹکڑوں سے مل کر بنتا ہے جنھیں پلیٹ کہا جاتا ہے۔

نظریہ ''پلیٹ ساختمانی'' یہ بتاتا ہے کہ کیسے مختلف ٹھوس نہایت وسیع ٹکڑوں پر مشتمل قشر ارض (Earth Crust) حرکت کرتا رہتا ہے۔ ان پلیٹوں کا حصہ صرف اوپر ٹھوس ارضی قشر نہیں ہوتا۔ نیچے کا گھنا قشر (Mantle) بھی اسی کا حصہ ہے جسے کرۂ زیر قشر ارض کہتے ہیں اور یہ براعظموں اور بحر اعظموں کو اپنے اوپر اس طرح سوار کیے ہوئے ہے جیسے کہ سمندر عظیم الشان بحری بیڑے کو ساختمانی پلیٹوں (Tectonic Plates) کی اوسط موٹائی 100 کلومیٹر ہوتی ہے۔ یہ لگاتار ایک دوسرے کے مدمقابل کرہ زیر قشر ارض پر بڑھتی رہتی ہے اور یہ حرکت 20 سینٹی میٹر ایک سال کے حساب سے ہوتی ہے۔ براعظم پلیٹوں کا صرف ایک حصہ ہی بناتے ہیں اور ان کو گہرے سمندر پلیٹوں کے باقی حصوں کی تکمیل کرتے ہیں۔ یہی پلیٹیں براعظموں اور سمندروں کو ساتھ ساتھ لیے ہوئے ہیں اور حرکت میں ہیں۔ متعلقہ پلیٹوں کا ایک دوسرے کے مدمقابل حرکات کا خلاصہ اور تقسیم ان کے

حاشیوں (Margins) سے کیا جاتا ہے۔ یہ حرکات تین طرح کی ہوتی ہیں: (1) تعمیری (Constructive)، (2) تخریبی (Destructive) اور (3) قدیم باتحفظ (Conservative)۔

بحر اوقیانوس (Atlantic Ocean) میں تعمیری پلیٹ کی حرکت کی بہترین مثال ملتی ہے۔ درمیانی سمندری سطح (Mid Ocean Ridge) پر نئے فرش بحر لگاتار پیدا ہو رہے ہیں جس کی وجہ سے دونوں امریکی براعظموں اور یورپی و افریقی براعظموں کے درمیان فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔

تخریبی پلیٹ حرکت بحر الکاہل (Pacific Ocean) کے حاشیوں پر ہر سمت نظر آتی ہے۔ جب ایک پلیٹ دوسری پلیٹ کے مد مقابل آگے بڑھ کر اس کے اوپر نیچے کی طرف دباؤ ڈالتی ہے تو دباؤ کی شدت سے دوسری پلیٹ احاطہ کیے کرۂ حجری (Lithosphere) کے نیچے جا کر تقسیم ہو جاتی ہے۔

قدیمی پلیٹ حرکت شدید تباہ کن زلزلہ پیدا کر سکتی ہے۔ زلزلے سے پہلے دو قریبی پلیٹیں ٹرانس فورم فالٹ (Transform Faults) کے قریب ایک دوسرے سے رگڑتی ہیں۔ اس کی مثال کیلی فورنیا کے سان اینڈریاز فالٹ سے دی جا سکتی ہے۔

26 دسمبر 2004 کو سنامی یا سمندری طوفان کو وجود میں لانے والی وجوہات تخریبی ساختمانی پلیٹ حرکت سے مطابقت رکھتی ہیں۔ انڈونیشیا کے ساحل سے دور جو زبردست زلزلہ آیا جس میں برمی ساختمانی پلیٹ اور ہندوستانی ساختمانی پلیٹ (ایک دوسرے کے مد مقابل ہیں) کا زبردست رول ہے۔ ہندوستانی پلیٹ نے آگے بڑھ کر برمی پلیٹ پر نیچے کی طرف دباؤ بنایا۔ اس دباؤ کی شدت سے برمی پلیٹ کے 1200 کلومیٹر احاطہ کیے ہوئے کرہ حجری کے نیچے کھسک کر تقسیم ہو گئے۔ برمی پلیٹ کی تقسیم اور شدت دباؤ سے سمندری پانی پر عمودی دباؤ بنا جس سے سنامی لہریں پیدا ہوئیں۔ سنامی لہروں کے دائرے ہر سمت ریل کے ڈبوں کی طرح پھیلتے چلے گئے اور زبردست تباہی کا موجب بنے۔

ہندوستانی ساختمانی پلیٹ (Indian Tectonic Plates) نے برمی پلیٹ پر نیچے کی طرف دباؤ ڈال کر اسے تقسیم کر دیا۔ اس دباؤ اور تقسیم سے خارج ہونے والی توانائی نے زمین کو اپنے محور سے ایک انچ جھکا دیا اور زمین کا اپنی کیل کے اوپر گھومنے کے وقت میں تین مائیکرو سکنڈ کا اضافہ ہو گیا۔

ہندوستان آئے دن قدرتی آفات سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ زلزلہ یا سیلاب، سنامی یا سمندری طوفان اور سائیکلون وغیرہ سے لوگوں کو نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ ان سے تحفظ کے مؤثر طریقے اپنانے کی ضرورت ہے جیسے پیشگی آگاہی والی تکنیک، متاثرہ علاقوں کی حد بندی وغیرہ تاکہ مستقبل میں سمندری طوفانوں کی ہولناک وحشت سے لاکھوں زندگیاں، املاک، مکانات اور قدرتی نباتات متاثر نہ ہوں۔

46, Nishat Apartments
Near Shamshad Market
A.M.U. Aligarh-202 002
(U.P.)

□□□

مجموعہ نغز

مصنف: قدرت اللہ قاسم

حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ المتخلص بہ قاسم کا لکھا ہوا شعرائے اردو کا یہ مشہور تذکرہ، دو جلدوں میں تھا جسے فاضل مرتب پروفیسر محمود شیرانی نے یکجا کر دیا ہے۔ پروفیسر شیرانی کا خیال ہے کہ محمد حسین آزاد کی مشہور تالیف آب حیات کا ایک اہم ماخذ یہ تذکرہ بھی ہے جس کا قلمی نسخہ انہیں آزاد کے ذخیرۂ کتب سے دستیاب ہوا۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 492، قیمت -/268 روپے

عربی ادب کی تاریخ (تین جلدوں میں)

مصنف: ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

مدارس کے علاوہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں عربی زبان و ادب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن اب تک اردو میں کوئی ایسی کتاب دستیاب نہیں تھی جس میں عربی ادب کی جامع اور مبسوط تاریخ بیان کی گئی ہو۔ ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی کی یہ کتاب اس کمی کو پورا کرتی ہے۔ کتاب کی پہلی جلد میں زمانۂ جاہلیت، دوسری جلد میں حضرت محمدؐ کے عہد سے خلفائے راشدین کے عہد نیز اموی دور اور تیسری جلد میں عباسی دور کا احاطہ کیا گیا ہے۔

صفحات: جلد اول: 352، جلد دوم: 390، جلد سوم: زیر طبع
قیمت: جلد اول: 86 روپے، جلد دوم: 91 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-066 110

حکیم اشہر قدیر

قبض ـــ اسباب اور علاج

قبض ایک عام مرض ہے۔ ضعیف العمری میں تو یہ مرض اور بھی زیادہ پریشان کرتا ہے اور اس کی وجہ سے دیگر امراض جیسے گیس کی تکلیف، دل کا گھبرانا اور سر کا درد وغیرہ بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

اگر قبض کی تکلیف کے اسباب کا علم ہو اور قبض ہونے کی صورت میں بروقت علاج ہو جائے تو قبض کے علاوہ اس کے نتیجہ میں ہونے والی متذکرہ بیماریوں کا سدِّ باب کیا جا سکتا ہے۔

قبض کیا ہے؟ بہتر ہے کہ پہلے یہ جان لیں کہ قبض کی صورتیں کیا ہیں۔ تین یا چار سال کی عمر کے بعد عموماً پاخانہ سے فراغت کی عادت میں نظم آ جاتا ہے اور روز صبح کے وقت یعنی چوبیس گھنٹے کے وقفہ سے فراغت کی حاجت ہوا کرتی ہے۔ اور اگر کسی شخص میں یہ حاجت چوبیس گھنٹے کے بجائے چھتیس، اڑتالیس یا اس سے بھی زیادہ مدت گزر جانے کے بعد لاحق ہو تو کہا جائے گا کہ وہ شخص قبض میں مبتلا ہے۔ یہ قبض کی سب سے عام صورت ہے۔ اس کے علاوہ قبض کی دو صورتیں اور وہ یہ ہیں کہ فراغت کی حاجت چوبیس گھنٹے کے وقفہ سے لاحق ہو لیکن بیت الخلا میں وقت زیادہ گزارنا پڑے اور ساتھ ہی ساتھ فراغت کے لیے مشقت بھی درکار ہو تو یہ بھی قبض کی ہی ایک صورت ہے۔ اور قبض کی تیسری صورت یہ ہے کہ فراغت روز ہو اور بیت الخلا میں وقت بھی زیادہ نہ لگے لیکن فراغت سے یکبارگی تشفی نہ ہو اور یہ احساس باقی رہے کہ پیٹ مکمل طور پر صاف نہیں ہوا اور پھر دن میں کسی وقت بیت الخلا کا رخ کرنا پڑے پھر کچھ فراغت ہو جائے لیکن مکمل تشفی نہ ہو تو یہ صورت حال بھی قبض میں ہی شمار ہوگی۔

قبض کے اسباب میں عمر، غذا، عادات و اطوار اور کچھ امراض بھی شامل ہیں۔ ضعیف العمری میں یہ شکایت عام ہو جاتی ہے جس کی خاص وجہ نظام ہضم یعنی جگر اور آنتوں کا ضعف ہے۔ بالخصوص آنتوں کی حرکات میں کمی اور سستی واقعہ ہونے سے غذا کے انجذاب اور ہضم میں تاخیر ہونے لگتی ہے اور نتیجہ کے طور پر فضلہ سے فراغت میں بھی تاخیر ہو جاتی ہے اور جب فضلہ زیادہ دیر تک آنتوں میں قیام کرتا ہے تو فضلہ تو مزید ہضم نہیں ہوتا البتہ فضلہ کے مائی اجزا آنتوں میں جذب ہوتے رہتے ہیں اور پاخانہ انتہائی سخت ہو جاتا ہے اور آنتوں سے بآسانی خارج نہیں ہوتا۔ قبض کی یہ صورت انتہائی تکلیف دہ ہوتی ہے اس سے مرض قولنج بھی پیدا ہو سکتا ہے جو ایک خطرناک بیماری ہے۔ قبض کا سب سے اہم سبب غذائی نقائص ہیں۔ جو ہر عمر میں قبض پیدا کر سکتے ہیں۔ دیر ہضم اور ثقیل اغذیہ کا بکثرت استعمال اور غیر متوازن غذا قبض پیدا کرنے میں پیش پیش ہیں۔ مثلاً۔ غذا میں گوشت، روغن، آٹا، چاول اور بیسن کا زیادہ استعمال اور پھل، سبزیاں اور مشروبات کا کم استعمال قبض پیدا کرتے ہیں۔ پر تکلف کھانے اور دعوتیں کہ جہاں قورمہ، بریانی، تندوری روٹی، لال روٹی اور مٹھائی وغیرہ کی کثرت ہوتی ہے۔ قبض پیدا کرنے کے خاص ذرائع ہیں۔

بعض اوقات انسان کی عادات و اطوار بھی قبض کا باعث ہوا کرتے ہیں جیسے نفیس طبیعت کا انسان ہر جگہ فراغت پر قادر نہیں ہوتا۔ دوران سفر یا کسی غیر جگہ قیام کے دوران یہ صورت حال سامنے آتی ہے۔ سفر کے دوران سرکاری بیت الخلا کے ناسازگار حالات طبیعت کو فراغت سے منحرف کر دیتے ہیں اور انسان فراغت کو ٹال دیتا ہے۔ بہت سے لوگ چلتی ٹرین میں بیت الخلا کا استعمال نہیں کرتے اور منزل پر پہنچنے تک فراغت کو ٹال دیا کرتے ہیں۔

قبض پیدا کرنے میں جو امراض معاون ہیں ان میں جگر کی خرابی سرفہرست ہے۔ ایک مرض یرقان سدّی ہے کہ جس میں صفرا کی نالی میں سدہ پیدا ہو جاتا ہے اور جگر سے صفرا آنتوں تک نہیں پہنچ پایا اور آنتوں کی حرکت مفقود ہو جاتی ہے نتیجتاً قبض کی شکایت ہو جاتی ہے۔ اس مرض کی خاص علامت یہ ہے کہ پاخانہ کا رنگ قدرے سفید یا بالکل سفید ہو جاتا ہے اور ایسی صورت میں سدہ کا علاج کیے بغیر قبض سے نجات ممکن نہیں ہوتی۔

ضعیف العمری پر تو کسی کا بس نہیں، ہر انسان کو ایک نہ ایک دن بوڑھا ہونا ہی ہے۔ لیکن غذائی احتیاط نہ صرف ضعیف العمر اشخاص بلکہ ہر عمر اور ہر جنس کے اشخاص کو قبض سے ممکنہ حد تک محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

ضعیف لوگوں کو چاہیے کہ وہ ثقیل اور دیر ہضم اغذیہ جیسے قورمہ، بریانی، تندوری روٹی، ابلا ہوا انڈا وغیرہ سے پرہیز کریں اور نیم سیال اور سادہ کھانا کھائیں جیسے مونگ کی دال کی کھچڑی، سوجی کا پتلا حلوہ، گیہوں کا دلیا، دہی کا رائتہ، دال اور ہری سبزیوں کا سوپ، پھلوں کی چاٹ (پپیتا، پختہ امرود، اور کیلے پر مشتمل) وغیرہ۔ صبح کے وقت دودھ (250 گرام) میں شہد (10 گرام) ڈال کر پینا اور رات کے وقت دودھ (100 گرام) میں روغن بادام شیریں (10 قطرے) ڈال کر پینا قبض کے لیے اکسیر ہے۔ اگر ان تدابیر کو معمول میں لائیں تو قبض ہوگا ہی نہیں۔

جوان لوگوں کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ غذا بہ احتیاط اور متوازن استعمال کریں۔ غذا پوری طرح گوشت، روٹی اور چاول پر مشتمل نہ ہو بلکہ اس میں سبزیاں بھی وافر مقدار میں ہوں۔ ہرے پتے کی سبزیاں، گاجر اور مولی کی سبزی کا زیادہ استعمال قبض سے حفاظت میں صد درجہ معاون ہوتا ہے۔

لیکن اگر احتیاط کے باوجود بھی کوئی شخص قبض میں مبتلا ہو جائے تو ضروری ہے کہ کچھ خاص تدابیر اور علاج اختیار کیا جائے۔ جیسے رات کا کھانا کھانے کے بعد چہل قدمی کرنا بزرگوں کے لیے نہایت ضروری ہے تاکہ ان کی آنتوں میں تحریک ہو اور وہ فضلہ کو خارج کرنے پر آمادہ رہیں۔ مشروبات بالخصوص پانی کا زیادہ استعمال قبض کو دور کرنے میں معاون ہوتا ہے۔ بعض اوقات دودھ کی بالائی اور مکھن کا استعمال بھی قبض کو دور کرتا ہے۔ دودھ میں مکھن اور گھی وغیرہ ڈال کر پینے سے قبض دور ہو جاتا ہے۔ لیکن ہر شخص کے لیے یہ نسخہ مناسب نہیں۔ بالخصوص جو افراد دل کے عارضہ میں مبتلا ہوں انھیں روغنی اغذیہ سے پرہیز کرنا چاہیے۔ گرم کپڑے یا گرم پانی کی بوتل سے پیٹ کی سینکائی بھی آنتوں میں تحریک پیدا کرتی ہے۔

قبض کو دور کرنے کے لیے کچھ آزمودہ نسخے بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں جیسے گرم دودھ (200 گرام) میں اسپغول کی بھوسی (10 گرام) کا استعمال رات کو سونے سے قبل کیا جائے تو یہ قبض کشا ثابت ہوتی ہے۔ اسی طرح گرم دودھ (100 گرام) میں منقیٰ (10 عدد) ڈال کر مزید ابال لیں اور پھر پئیں تو قبض دور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح صبح کے وقت گلقند (20 گرام) کا استعمال بھی قبض کا علاج ہے۔ مذکورہ نسخوں کے علاوہ معالج کے مشورے سے بھی ادویہ کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔

بعض اوقات قبض اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ ہر نسخہ بے کار ثابت ہوتا ہے اور اجابت کو سات سے دس دن تک ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ معالج کے مشورے سے ANEMA کا استعمال کیا جائے جہاں کچھ خاص قسم کی ادویہ اور چکنائی ٹیوب کے ذریعہ مریض کی مقعد سے آنتوں میں داخل کی جاتی ہے جو فضلہ کو نرم اور چکنا کر کے خارج کرواتی ہیں۔ شدید قبض سے دوچار مریضوں میں بذریعہ دست بھی فضلہ خارج کرنے کی نوبت آ جاتی ہے جس سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔

7/A, Ghaffar Manzil,
Jamia Nagar, New Delhi-25

□□□

کلیاتِ محمد قلی قطب شاہ

مرتبہ: سیدہ جعفر

گولکنڈے کا پانچواں تاجدار اور شہر حیدرآباد کا بنیاد گزار قلی قطب شاہ فنون لطیفہ کا قدر شناس اور خود ایک خوش فکر شاعر تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کا یہ کلیات سیدہ جعفر صاحبہ نے تحقیقی انداز میں مرتب کیا ہے اور اس پر انھوں نے جو مقدمہ لکھا ہے وہ نہ صرف محمد قلی قطب شاہ کی شخصیت کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتا ہے بلکہ گولکنڈے کی تاریخ پر بھی خاطر خواہ روشنی ڈالتا ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کی تصویر کے علاوہ حیدرآباد کی اہم عمارتوں کی تصویریں بھی کتاب میں دی گئی ہیں۔

صفحات: 823، قیمت -/175 روپے

کلیاتِ سراج

مرتب: پروفیسر عبدالقادر سروری

سراج اورنگ آبادی کو اردو کا پہلا صوفی منش شاعر کہا جا سکتا ہے لیکن ان کی شاعری متصوفانہ کیفیات کے علاوہ بھی بہت کچھ اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ ان کا یہ کلیات دکنیات کے ماہر پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم نے بڑی کاوش و کوشش کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ شروع میں بسوط مقدمہ بھی ہے جس میں سراج کی شخصیت اور شاعری کے اہم پہلوؤں پر عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 732، قیمت: -/138 روپے

کلیاتِ عیش

مرتبہ: ڈاکٹر حبیبہ بانو

حکیم آغا جان عیش دہلوی ذوق، مومن اور غالب کے ہم عصروں میں تھے اور بہادر شاہ ظفر کے دربار میں بھی انھیں رسائی حاصل تھی۔ غالب کی مشکل پسندی پر ان کا طنزیہ قطعہ "گر ان کا کہا وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے" مشہور ہے مگر غالب کی وفات پر انھوں نے جو تاریخی قطعہ بند اشعار کہے ہیں، وہ غالب سے ان کی محبت و مودت کو ظاہر کرتے ہیں۔ عیش خوش فکر شاعر تھے اور انھوں نے اپنا مرتب دیوان غزلیات اپنی زندگی ہی میں مرتب کر لیا تھا۔ ڈاکٹر حبیبہ بانو کے مرتب کردہ اس کلیات میں غزلوں کے علاوہ وہ دیگر اصناف فن بھی ہیں جو عیش سے یادگار ہیں۔ مفصل مقدمے کے ساتھ۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 558، قیمت: -/80 روپے

گلشنِ بے خار

مصنف: نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

یہ اردو شعرا کا مشہور تذکرہ ہے جو نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے بزبان فارسی قلمبند کیا تھا اور اس کے بعض بیانات، اس دور کے شعرا کا ذکر آتے تو آج بھی دہرائے جاتے ہیں جس سے یہ تاریخی اہمیت کا حامل تذکرہ ہو گیا ہے۔ اس اہم تذکرے کو جو متقدمین سے شیفتہ کے زمانے تک کے ساڑھے چھ سو سے زائد شعرا اور شاعرات کے مختصر کوائف اور نمونۂ کلام پر مشتمل ہے، محترمہ حمیدہ خاتون نے اصل کتاب کے مستند نسخوں کو سامنے رکھ کر سلیس اردو میں منتقل کیا ہے اور شروع میں ایک سیر حاصل مقدمہ لکھا ہے۔

پہلا ایڈیشن: صفحات: 430، قیمت -/128 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

تحریر: مدن گوپال
ترجمہ: فاخر شبیر عباسی

چین کا حملہ

نہرو، جنھوں نے ہندوستانی عوام کو دوسرے ممالک کے ساتھ تعلقات اور عالمی معاملات سے آگاہ کیا تھا، بنیادی طور پر ایک مثالیت پسند انسان تھے۔ جس وقت جاپان نے چین پر حملہ کیا اس وقت نہرو نے چین کی طرفداری کرتے ہوئے کانگریس کو مجبور کیا کہ وہ ہندوستان سے چین کے لیے ایک طبی مشن روانہ کرے۔ جدو جہد آزادی کے پورے عرصے میں اور دوسری عالمی جنگ کے اولین برسوں میں نہرو نے وفاقی نظام حکومت کی زبردست وکالت کی تھی۔ دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ سبھی غلام ممالک کو آزاد کر دیا جائے، اور یہ کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایشیائی ممالک کا ایک وفاق قائم کریں جس میں چین، جاپان، ہندوستان، برما، افغانستان، مغربی ایشیائی ممالک اور یو.ایس.ایس.آر. کے ایشیائی جمہوری ممالک شامل ہوں۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد بھی نہرو کی مثالیت پسندی ان کی خارجہ پالیسی پر اثر انداز ہونے والی تھی۔ یہ مثالیت پسندی ہی تھی جس نے اشتراکی چین کی اہمیت پر ان کے ردعمل کی تصویر کشی کی تھی۔ انھوں نے اس بنیادی حقیقت کو پہچان لیا تھا کہ چین کا انقلاب محض ایک محلاتی انقلاب نہیں تھا بلکہ اس میں لاکھوں چینی عوام بھی شریک تھے۔ ہندوستان نہ صرف یہ کہ ان میں سے پہلا تھا جس نے چین کی عوامی جمہوریت کو تسلیم کیا بلکہ اس نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے بھی ایسا ہی کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ آزادی کے بعد چینی کیمونسٹ رہنما انھیں پسند نہیں کرتے تھے، نہرو مستقل ہمالیہ کے دونوں اطراف کے طاقتور ممالک کے درمیان دوستی کے خواہاں تھے، اور ہمیشہ دوستی کے اس بندھن کو وہ دو ہزار سال پرانا بتاتے تھے جس کے دوران ان دونوں کے درمیان کبھی کوئی جنگ نہیں ہوئی۔ ان کے خیال میں ایشیا اور پورے عالم میں امن کے نقطۂ نظر سے ہند، چین امن بے حد اہمیت کا حامل تھا۔

ان کے خیال میں چین کی عوامی جمہوریت کے نئے رہنما ایشیا میں فروغ کے مسئلے سے قطعی لاتعلق تھے، اور انھیں توقع تھی کہ انھیں جلد ہی حالات کا صحیح اندازہ ہو جائے گا۔ جب 1950 میں چین کی فوجیں کوریائی جنگ میں شامل ہوئیں تو ہندوستان نے ایک حملہ آور کی حیثیت سے اقوام متحدہ کے ذریعے چین کی مذمت کی مخالفت کی۔ 1951 میں ہندوستان نے امن معاہدے کے لیے ہونے والی سین فرانسسکو کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا کیونکہ دوسری وجوہات کے علاوہ چین اس کا ایک حصہ نہیں تھا۔

نہرو کو یہ توقع تھی کہ چین آزادی کے بعد ابھرتے ہوئے ہندوستان کے اصل کردار کو سمجھے گا اور جب کہ ہندوستان چین کے ساتھ دوستی کے لیے پورے انہماک کے ساتھ کام کر رہا تھا، مؤخرالذکر نے 1950 میں سامراجی حملے سے تیس لاکھ تبتیوں کی آزادی کا اعلان کر دیا۔ ہندوستان نے جس کے تبت کے ساتھ بہتر تعلقات تھے، چین سے درخواست کی کہ اس اقدام سے تبت کے ساتھ اس کی سرحد پر غیر مستحکم حالات پیدا ہو جانے کے امکانات ہیں۔ ہندوستان کا واضح نظریہ یہ تھا کہ چونکہ تبت چین کا حصہ نہیں ہے اس لیے اسے تبت کے عوام کی خواہشات پر چھوڑ دینا چاہیے اور اس کے لیے کوئی قانونی یا آئینی مباحثہ نہیں ہونا چاہیے۔ چین نے اس پر کوئی ردعمل نہیں ظاہر کیا۔ اس کی فوجیں 7 اکتوبر 1950 کو تبت میں داخل ہو گئیں۔

ایک چینی نعرے کے مطابق، تبت چین کی ہتھیلی تھا جب کہ نیپال، بھوٹان، سکم، لداخ اور آسام کی شمالی مشرقی سرحد کا حصہ اس کی پانچ انگلیاں تھیں۔ "اب جب کہ ہتھیلی چین کے پاس جا چکی تھی، پانچ انگلیوں کو بھی اس کے ساتھ جانا چاہیے تھا۔" چین نے ہندوستان اور سکم کے درمیان تعلقات کے معاہدے کی بھی پرواہ نہیں کی جس کی حفاظت ہندوستان کی ذمہ داری تھی۔ شمال مشرقی سرحد ایجنسی (NEFA) کی شمالی سرحد کو فروری 1914 ہی میں نقشے پر واضح کر دیا گیا تھا جب میک موہن (McMohan) نے تبت کی جنوبی سرحد کے نقشے کی نشاندہی کی تھی۔ یہ وہی نقشہ تھا جو شملہ معاہدے کے مسودے میں منسلک کیا گیا تھا۔ چینی وفد نے ہندوستان کے ساتھ تبت کے

"Turning Points of Indian History" جناب مدن گوپال کی بے حد اہم کتاب ہے جس میں ہندوستانی تاریخ کے ان پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا ہے جنھوں نے ہندوستانی تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ "اردو دنیا" میں اس کا ترجمہ "ہندوستانی تاریخ کے اہم موڑ" کے نام سے قسط وار شائع کیا جارہا ہے۔

ذاتی تعلقات طے کرنے کے حق کو تسلیم کیا تھا۔

آسام کے چائے باغات میں قانون اور انتظامیہ کے ذریعے ہندوستان کی دولت کو برباد کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھنے والے انگریزوں نے شمالی مشرقی سرحد ایجنسی کے قبائلی سرداروں کے وجود کو تسلیم کیا۔ برطانوی ماہرین حربیات کے مطابق سرحد کی قطعہ زمین اور پہاڑی قلعوں کی نوعیت ایسی تھی کہ ان کی حفاظت کے لیے ایک سپاہی کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ جس وقت جاپان نے چین کو فتح کیا اور سدیا کے راستے چین کو رسد بھیجنے کے لیے ایک شاہراہ تیار کی گئی، اس علاقے کو تمام عملی مقاصد کے لیے یکسر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔

جب ہندوستان کو آزادی حاصل ہوئی تو اس نے ان دور دراز علاقوں میں ایک نئی تشکیل شدہ سرحدی انتظامیہ کے ذریعے حکومت چلانے کا منصوبہ تیار کیا۔ اس کا ارادہ نہ صرف یہ کہ شہری انتظامیہ کے فوائد کو وسعت دینا تھا بلکہ طبی، تعلیمی اور اقتصادی فروغ کے کاموں کو بھی آگے بڑھانا تھا جو کہ ایک فلاحی ملک کی حیثیت سے اس کے فرائض کا ایک حصہ تھا۔

ابھی یہ کام جاری ہی تھا کہ تبت پر چینی تسلط سے ایک نیا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اقوام متحدہ میں تبت کی درخواست کی حمایت سے ہندوستان کے انکار کی پارلیمنٹ میں بڑی شدت کے ساتھ مذمت کی گئی۔ نائب وزیر اعظم ولبھ بھائی پٹیل نے نومبر 1950 میں نہرو کو ایک تفصیلی خط لکھا جس میں انھوں نے چین پر غداری اور بدعنوانی کا الزام لگایا، اور پیکنگ میں ہندوستانی سفیر کے۔ ایم۔ پانکر کو چینیوں کے ذریعے نہرو کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی خفیہ سازش میں شریک کار ٹھہرایا۔ پٹیل نے چین کو سیاسی دشمن قرار دیا اور ہندوستان کی ''چین پالیسی'' پر نظر ثانی کرنے اور متنازعہ علاقوں میں دوبارہ فوجیں بھیجنے کا مشورہ دیا۔ نہرو اس پر راضی نہیں ہوئے۔ تبتی رہنماؤں کو مایوس کرتے ہوئے، انھوں نے چین کے تئیں دوستی کی اپنی پالیسی کو برقرار رکھا۔

مئی 1951 میں چین کی شرائط کو تسلیم کرتے ہوئے تبتی رہنماؤں نے پیکنگ میں ایک معاہدے پر دستخط کیے۔ ہندوستان کو ابھی بھی یہ امید تھی کہ چین تبت کی خود مختاری کا لحاظ کرے گا۔ ہندوستان کی دعوت پر 1953 کے آخری دنوں میں گفتگو کا آغاز ہوا۔ اس میں پنچ شیل یا پر امن بقائے باہمی کے پانچ اصولوں کی بنیاد پر ایک معاہدہ ہوا۔ ہندوستان کے لیے یہ اصول بین الاقوامی ضابطۂ اخلاق تھے لیکن چین کے لیے یہ محض سیاست کے عارضی آلۂ کار تھے۔ توثیق کے چھ ہفتوں کے اندر چین نے وقفے وقفے سے ہندوستان کی 2640 میل لمبی سکم اور بھوٹان سرحد کے مغربی، وسطی اور مشرقی علاقے کے مختلف حصوں کو غصب کرنا شروع کر دیا۔ جو نقشہ چین تیار کر رہا تھا اس سے اس کے ارادے صاف ظاہر تھے۔ ان نقشوں میں ہندوستانی سرزمین کے بڑے حصوں (تقریباً 50,000 مربع میل) کو چین کا حصہ دکھایا گیا تھا۔ جب نہرو نے چاؤ ان لائی کی توجہ اس نقشے کی طرف مبذول کرائی تو چاؤ نے کہا کہ ''یہ نقشے تو محض پرانے کومنتانگ نقشوں کی مدد سے تیار کیے گئے ہیں جس پر نظر ثانی کے لیے عوامی جمہوریہ حکومت کو وقت نہیں ملا۔'' دو برسوں کے بعد، نومبر 1956 میں اور پھر جنوری 1957 میں دہلی میں چاؤ نے نہرو سے کہا کہ سرحد کے متعلق کوئی تنازعہ نہیں ہے اور یہ کہ محض بعض چھوٹے مسائل ہیں جنھیں دونوں حکومتوں کے نمائندے مل کر حل کر سکتے ہیں۔ انھوں نے نہرو سے یہ بھی کہا کہ چین نے برما کی سرحد کو اسی طرح قبول کر لیا ہے جیسا کہ 1914 میں اس کی نشاندہی کی گئی تھی (میک موہن لائن جو ہندوستان اور برما کو محیط تھی، اس وقت ہندوستان کا حصہ تھی)، اور یہ کہ وہ اس معاملے میں تبتی حکمرانوں سے رابطہ قائم کریں گے۔ ایک طرف تو چین ہندوستان کے ساتھ مذاکرات کر رہا تھا۔ دوسری طرف 1957 میں اس نے خفیہ طور سے لداخ کے اکسائی چن علاقے میں ایک شاہراہ کی تعمیر شروع کی جو سنکیانگ (Sinkiang) کو تبت سے جوڑتی تھی، اس کے بعد اس نے چرناک قلعے پر قبضہ کر لیا جو مغربی حصے میں تھا۔

جولائی 1958 میں مشرقی حصے میں، جو کہ میک موہن لائن کے ذریعے محفوظ کیا گیا تھا، چینی فوجی دستے لوہت ضلع کے داونگ میں داخل ہوئے۔ وسطی حصے میں بھی انھوں نے مداخلت کی۔ جب نہرو نے 1954 میں اور اس کے بعد کی ان کی یقین دہانیوں سے متعلق استفسار کیا، تو اس کے جواب میں 23 جنوری 1959 کو چاؤ ان لائی نے نہرو کو اپنے ایک خط میں لکھا ''متعدد پیچیدہ عناصر کو مدنظر رکھتے ہوئے چینی حکومت نے میک موہن لائن کے تئیں کم و بیش حقیقت پسندانہ رویہ اپنانا اور اس سلسلے میں مصلحت سے کام لینا ضروری سمجھا، اور حکومت کو اس معاملے سے نپٹنے کے لیے مزید وقت کی ضرورت ہے۔''

جب کہ ہندوستان کی شمالی سرحد کے مختلف حصوں میں چین کی دخل اندازیوں سے تناؤ کا ماحول پیدا ہو گیا تھا، تبت کی بغاوت کو چینی فوج نے کچل دیا اور دلائی لاما نے 31 مارچ 1959 کو لاسا سے بھاگ کر ہندوستان میں سیاسی پناہ حاصل کی۔ چین کی ان حرکتوں کی مغرب میں شدید مذمت کی گئی، جس کی بازگشت ہندوستانی سیاسی پارٹیوں اور اخبارات کے ذریعے گونج رہی تھی۔ چین نے دلائی لاما کے تئیں ہمدردی کے خلاف احتجاج کیا اور تبت میں کام کرنے والے ہندوستانی افسروں اور تبت کے لیے جانے والے زائرین

کے لیے مشکلات کھڑی کر دیں۔ تین مہینوں کے اندر، ایک چینی فوجی دستے نے نیفا کے سبانسری (Sabansiri) حلقے میں لنگجو (Longju) پر قبضہ کر لیا۔ ستمبر 1959 تک چین نے واضح طور پر ایک مخالفانہ رویہ اختیار کر لیا تھا۔ اس نے وسطی اور مغربی علاقوں پر بھی دوبارہ اپنا حق جتایا۔ چینی حکومت نے واضح طور سے میک موہن لائن کو تسلیم نہیں کیا تھا۔

اس کے بعد ایک مہینے کے اندر چین کا چہرہ پوری طرح سے بے نقاب ہو گیا۔ اس نے اپنے فوجی دستوں کو ہندوستانی علاقے میں چالیس میل اندر جانگ چینمو وادی میں بھیج دیا۔ اس توقع سے کہ دونوں طرف کے عوامی اشتعال کے بغیر دونوں ممالک کے معاہدے کے ذریعے تنازعات کا کوئی پرامن حل نکل آئے گا، نہرو نے ہندوستانی زمین پر چین کی دخل اندازیوں کی اطلاع کو ہندوستانی عوام کو نہیں دی۔

چین نے تجویز پیش کی کہ ہندوستان اور چین مشرقی حصے میں میک موہن لائن سے اور مغربی حصے میں جسے چین "اصلی کنٹرول لائن" (Line of actual control) سے 20 میل پیچھے ہٹ جائیں۔ اس نئی تجویز میں وہ علاقے بھی شامل تھے جو 1956 میں چین کے نقشے میں نہیں دکھائے گئے تھے۔ دوسرے لفظوں میں اب چین لداخ کا تیس ہزار مربع میل علاقہ ہڑپ کرنا چاہتا تھا۔ ان امور پر گفتگو کے لیے کی جانے والی بار بار کی پیش کش کے نتیجے میں صرف سرکاری ٹیموں کا قیام ہی عمل میں آیا۔ حالانکہ، چینی ٹیم نے مغربی حصے میں صف بندی پر گفتگو سے انکار کر دیا۔ چین نے قبول کیا کہ اس کی فوج نے 1950 میں بغیر کسی مزاحمت کے اکسائی چن علاقے کو عبور کیا تھا، اور یہ کہ اس نے 1954-55 میں اس علاقے کا سروے کیا تھا اور بالآخر وہاں پر ایک شاہراہ تعمیر کی تھی۔

پرامن حل کی کوشش میں، نہرو اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ انھوں نے چین کو اکسائی چن شاہراہ کو عوامی آمد و رفت کے لیے استعمال کرنے کی رعایت کی پیشکش کی۔ اس کے جواب میں چین نے ہندوستانی علاقے کی طرف مزید پیش قدمی کی، خاص طور سے لداخ میں چپ چاپ (Chip Chap) علاقے گلوان وادی اور پیانگانگ جھیل کے علاقے کی طرف۔

مغربی حصے میں لداخ کے ایک بڑے علاقے پر چین کے قبضے نے ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا جس سے ہندوستان کی حکومت بہت دباؤ میں تھی۔ اس ڈر سے کہ وہ مشرقی حصے میں بھی ایسا ہی کر سکتے ہیں، حکومت نے دسمبر 1961 میں مشرقی کمانڈ سے نئی فوجی چوکیاں قائم کرنے کے لیے کہا، تاکہ میک موہن لائن تک پوری سرحد کا موثر طریقے سے دفاع کیا جا سکے۔ اگلے چھ مہینوں کے اندر چوبیس چوکیاں قائم کی گئیں جن میں نمکا چو (Namka Chu) پر ڈھولا کی چوکی بھی شامل تھی۔ ہندوستانی فوجی دستے ٹھگلا رج (Chagla Ridge) تک پہنچے اور Khirzemane میں ایک فوجی چوکی قائم کی۔ جب 200 سپاہیوں پر مشتمل ایک چینی فوجی دستہ درجن بھر آسام رائفل کے جوانوں کو پیچھے دھکیلنے کے لیے بڑھا تو ہندوستان نے احتجاج کیا۔ چینی فوج پیچھے ہٹ گئی۔ ہندوستانی فوجیں اس پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے آگے بڑھیں۔ 8 ستمبر 1962 کو چین نے ڈھولا چوکی کی طرف کوچ کیا۔ حالانکہ، انھوں نے اس کا گھیراؤ نہیں کیا لیکن قریب ہی خیمہ زن ہو گئے۔

20 ستمبر 1962 کو چینیوں نے نیفا علاقے کی ٹھگلا سرحد کو عبور کیا۔

6 اکتوبر 1962 کو نہرو نے اپنی گیارہ دنوں پرانی پیشکش کو دہرایا کہ حکومت ہند مغربی حصے میں سابقہ حالت کو برقرار رکھنے کے اقدامات اور تناؤ کی وجوہات کو دور کرنے کے لیے گفتگو کے لیے تیار ہے۔ نہرو کی پیشکش کا جواب چین نے اگلے دن ٹھگلا رج (Thagla Ridge) کے پیچھے بھاری میزائلوں اور توپ کے گولوں سے دیا۔ 10 اکتوبر کو ہندوستانی فوجوں نے سینگ جونگ (Tseng Jong) میں اپنی ہی فوجی چوکی پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن انھیں کامیابی نہیں ملی۔ ایک ہفتے کے اندر چین نے ٹھگلا رج کے جنوبی حصے میں اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ بڑی تعداد میں سامان ڈھونے کے لیے مزدوروں، فوجی ٹکڑیوں اور ٹٹوؤں کا استعمال کیا گیا۔ 19 اکتوبر کو فوجی نقل و حرکت بھی شروع ہو گئی اور سینگ جونگ میں دو ہزار سپاہیوں کی ایک فوج جمع ہو گئی۔ رات آتے ہی انھوں نے خود کو گرم رکھنے کے لیے آگ روشن کی۔ وہ پوری طرح سے مطمئن تھے کہ ہندوستانی فوج گولی باری نہیں کرے گی۔ وہ جانتے تھی کہ وہ راستہ جو انھوں نے سانگچو وادی میں تیار کیا تھا اور جنوب کی طرف کے معاون راستے جو میک موہن لائن کے کچھ اندر تک جاتے تھے وہ چینی فوج کے لیے سودمند تھے۔ ہندوستان کی جانب کے راستے بے حد دشوار تھے۔ یہ گھنے جنگلوں سے گھرے ہوئے تھے۔ نیز، وادی کی شمال جنوبی ڈھلانیں موخرالذکر کے لیے دشواریاں کھڑی کر رہی تھیں۔ جاڑوں میں ہونے والی برفباری نے اسے اور بھی خطرناک بنا دیا تھا۔ وادی کو کاٹتی ہوئی تقریباً 300 فٹ گہری توانگ اور لوہت ندیوں پر ہندوستانی فوجوں نے رسی اور بانس کی مدد سے معلق پل بنا رکھے تھے جسے گاڑیوں کا تو ذکر کیا، خچروں کے ذریعے بھی عبور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

نمکا چو میں پانی کی سطح کم ہو جانے اور ندی کے قابل عبور ہوتے ہی 20 اکتوبر کو چینیوں نے ہندوستانی صفوں کے خلاف اپنے حملے پر توجہ مرکوز کی۔

ہندوستانی ٹکڑیوں نے بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا، لیکن جلد ہی انھیں پسپا کر دیا گیا۔ چین کا منصوبہ مرکز پر حملہ کرنا اور تنگا پار اور تھنگلا پر قبضہ کرنا تھا، تا کہ لب دریا پر موجود ہندوستانی فوج اپنے بچاؤ اور رسد لائن سے کٹ جائے اور اس طرح آسانی کے ساتھ اس سے نمٹا جا سکے۔ دوسرے دن، یعنی 21 اکتوبر کو پیکنگ نے کھلے عام یہ اعلان کر دیا کہ چینی فوجوں کو یہ تاکید کر دی گئی ہے کہ وہ میک موہن لائن کو کوئی اہمیت نہ دیں۔ کم و بیش بیس ہزار چینی فوجی اچانک کمینگ ضلعے پر ٹوٹ پڑے اور ڈھولا تھگلا رج، خزمان سیلا اور بومدی لال کا محاصرہ کر لیا۔ دباؤ اس قدر تھا کہ توتنگ کو خالی کرنا پڑا۔ چونکہ چینی حملے کا دوسرا رخ موہت ضلع کی طرف تھا، اس لیے دو پیادہ دستوں اور آسام رائفل کے کچھ سپاہیوں کو لوہت ضلعے کے ہیڈ کوارٹر والونگ میں تعینات کر دیا گیا۔ یہاں پر چینیوں کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔ سخت لڑائی کے بعد آخر کار والونگ کو پسپائی کا سامنا کرنا پڑا۔

ہندوستانی فوج کی پیغام رسانی دراصل اتنی خراب تھی کہ جنرل بی. ایم. کول کے پہلے اہم ترین پیغام کو نکاچو سے دہلی پہنچنے میں تین دن لگ گئے۔ چینیوں نے اپنے لاتعداد مزدوروں، پیادہ فوجوں اور کھدائی کے سامانوں کی مدد سے مضبوط سرنگیں اور خندقیں تیار کی تھیں جو پیغام رساں آلات سے لیس تھیں۔

چین کا اچانک حملہ قطعی غیر متوقع تھا۔ جیسا کہ نہرو نے پارلیمنٹ میں کہا ''آخری لمحے تک ہمیں اس حملے کی توقع نہیں تھی۔'' اس لیے دراصل پورے نیفا علاقے میں صرف دو فوجی دستے موجود تھے اور وہ بھی پورے علاقے میں بکھرے ہوئے تھے، بغیر کسی دفاعی منصوبے یا حکمت عملی کے۔ دوسری طرف چینیوں کی تین ٹکڑیاں نیفا میں لڑ رہی تھیں۔

جہاں کہیں بھی ہماری فوجوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا، چینیوں کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ مثال کے طور پر والونگ اور ریز انڈلا میں چین کو اچھی خاصی تعداد میں جانی نقصان ہوا۔ تھمبا تگ میں تین سے چار سو چینی مارے گئے۔

حالانکہ عام طور سے دیکھا جائے تو ہماری فوجیں ہیجان زدہ ہو گئی تھیں۔ 20 نومبر تک نیفا میں ہماری فوجوں میں ابتری پھیل گئی تھی اور ہمارے 1885 سپاہی مارے گئے، 1696 لاپتہ ہو گئے اور 3968 قیدی بنا لیے گئے۔

چین نے غداری کیوں کی؟ اس کی متعدد وضاحتیں کی گئیں ہیں۔ بعض ماہرین کے مطابق چین کو ترقی کے راستے میں ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس کی معیشت بہت ہی سخت مشکل میں تھی، اور اسے اپنے عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے جرأتمندانہ قدم اٹھانے کی ضرورت تھی۔ بین الاقوامی اشتراکیت میں چین کی پوزیشن پر التفات بھی ایک اہم عنصر تھا۔ چین اشتراکی دنیا کی رہنمائی کو سوویت یونین سے ہتھیا کر اسے خبردار کرنا چاہتا تھا۔ صرف ایک ہفتے قبل ہی چھا (Chha) میں روسی میزائلوں کی موجودگی واشنگٹن کے علم میں آئی تھی اور امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ چین نے سوچا کہ امریکہ سے اپنے اختلافات کو دیکھتے ہوئے سوویت یونین ہندوستان کی اعانت نہیں کرے گا۔ بجائے اس کے وہ چین کے ساتھ اپنے تعلقات کو بحال کرے گا اور اس کی طرفداری کرے گا۔

پاکستان سے موصول اطلاعات سے چین کو اندازہ ہوا کہ ایوب حکومت ہندوستان کی مشکلات کا فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ چونکہ پاکستان کی طرف سے واقعی خطرہ بنا ہوا تھا، اس لیے ہندوستانی فوجیں پنجاب سے مشرقی حصے کی طرف نہیں جا سکتی تھیں۔

ہندوستان کو یوں بھی مایوسی ہوئی کہ اکثر ممالک جن کی ماضی میں اس نے مدد کی تھی، اس کی اعانت کو نہیں آئے۔ یہاں تک کہ سوویت یونین بھی ہندوستان کو چین کے ساتھ معاملات سلجھانے کا مشورہ دیتے ہوئے اس سے غیر جانبدار رہا اور کہا کہ چین کے ساتھ اس کے تعلقات ''برادرانہ'' ہیں جب کہ ہندوستان کے ساتھ ''دوستانہ''۔

پھر، اچانک 21 نومبر 1962 کی نصف شب کو چین نے یک طرفہ جنگ بندی کا اعلان کر دیا۔ جنگ بند ہونے کے بعد کولمبو کی تجاویز سامنے آئیں، لیکن چین کا ردعمل جارحانہ تھا۔ جنگ بندی کے فوراً بعد ہندوستان نے مغربی اور وسطی حصوں میں حقیقی کنٹرول لائن سے بیس کلومیٹر پیچھے ہٹ جانے کی چین کی مانگ کو نظر انداز کر دیا۔ مشرقی حصے میں آسام رائفل کے جوانوں نے ٹھیک میک موہن لائن تک فوجی گشت کی۔

قابل ذکر یہ ہے کہ، نہرو نے بیجنگ کے ساتھ اپنے سیاسی تعلقات ختم نہیں کیے۔ اور نہ ہی انھوں نے اقوام متحدہ میں چین کے داخلے کی اعانت کی اپنی بنیادی پالیسی کو ترک کیا۔ حالانکہ بعض اہم نکتے ابھر کر سامنے آئے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ بیس صدی قدیم دوستی کی داستان ایک جھٹکے سے ختم ہو گئی بلکہ نہرو کی مثالیت پسندی کی دیوار بھی مسمار ہو گئی۔

□□□

سید اقبال امروہوی

ہنری برگساں — فلسفی اور سیاست داں

ہنری برگساں اپنے زمانے کا ایک عظیم فلسفی اور ماہر نفسیات تسلیم کیا جاتا ہے۔ فرانس میں اس نے اپنی زندگی میں ہی شہرت کے آسمان چھو لیے تھے۔ اس کی شہرت کی وجوہات صرف اس کا فلسفہ، اس کے نظریات اور اس کی تعلیمی خدمات ہی نہیں تھیں بلکہ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے فرانس کی سیاست میں بھی نمایاں کام انجام دیے تھے اور عالمی سطح پر فرانس کو عزت اور وقار دلانے کا باعث بنا تھا۔ اس نے 21 سال تک فرانس کے سب سے زیادہ قابل فخر تعلیمی ادارے College de France میں فلسفے کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور اس مدت میں کئی مشہور دانشور اور مفکر اس ادارے سے نکلے جنھوں نے فرانس میں اپنے اپنے شعبوں میں شہرت حاصل کی۔

ہنری برگساں ایک یہودی خاندان میں 18/اکتوبر 1859 کو پیرس میں پیدا ہوا۔ اس کی ماں برطانیہ کی رہنے والی تھی اور باپ پولینڈ کا باشندہ تھا۔ ہنری برگساں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بچپن سے ہی کافی ذہین تھا اور اپنی کلاس میں ہمیشہ امتیازی شان کو برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھا۔ اسکول میں اس کی دلچسپی علم ریاضی میں تھی اور جب اس نے 1877 میں علم ریاضی میں فرانس کا قابل فخر انعام حاصل کیا تو اس کے پروفیسر نے کہا تھا کہ ہنری آگے چل کر علم ریاضی میں کوئی کمال دکھانے والا ہے۔ لیکن ہنری نے اپنے اس پروفیسر کی پیش گوئی صحیح ثابت نہیں ہونے دی اور جب وہ کالج میں داخل ہوا تو اس نے فلسفہ کو اپنا موضوع بنایا اور فلسفے میں ہی اس نے پیرس کے ایک مشہور کالج سے امتیازی پوزیشن سے گریجویشن مکمل کیا۔ اس دوران فلسفے کے ہی ایک شعبے نفسیات کو بھی اپنی دلچسپی کا مرکز بنایا اور اپنا پہلا تحقیقی مقالہ What is Value of Contemporary Psychology تصنیف کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے امیدوار ہو گیا اور اسی مقالہ پر اسکوڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔

برگساں کا پہلا اہم کام جو 1886 میں فلسفے کے ایک جرنل میں On Unconscious Stimulation in States of Hypnosis کے عنوان سے شائع ہوا تو وہ نفسیات سے ہی متعلق تھا۔ یہ مقالہ عمل تنویم پر مسلسل مشاہدہ اور تجربات کے بعد تحریر کیا گیا تھا۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ہسٹیریا کے متعلق سگمنڈ فرائڈ اور ڈاکٹر برائر نے مل کر جو کام انجام دیا تھا وہ 1896 میں شائع کیا تھا۔ اس لیے کچھ مفکرین کا خیال ہے کہ عمل تنویم کے تعلق سے لاشعور کا تصور فرائڈ سے بھی پہلے برگساں نے پیش کیا۔ لیکن ان لوگوں کے خیال سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کیونکہ عمل تنویم کا استعمال سب سے پہلے فرانس میں ڈاکٹر شارکو نے ہی کیا تھا اور 1885 میں خود فرائڈ نے فرانس کا سفر کیا اور تقریباً ایک سال وہاں رہ کر اس نے عمل تنویم پر تجربات کیے یا کہہ سکتے ہیں کہ اس کی تربیت حاصل کی اور پھر واپس ویانا آکر ڈاکٹر برائر کے ساتھ مل کر اس سلسلہ میں مزید تحقیقات اور تجربات کیے اور اس کے بعد دونوں نے مل کر اپنے تجربات اور تحقیق پر مشتمل تفصیل سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جب کہ برگساں خود فرانس کا رہنے والا تھا اور وہ ڈاکٹر شارکو کے کام سے بھی واقف ہوگا دوسرے یہ بھی غور کرنے کی بات ہے کہ اس نے عمل تنویم کے تعلق سے لاشعور کا جو ذکر کیا ہے اس کا مفہوم فرائڈ کے مفہوم سے کچھ مختلف ہو سکتا ہے کیونکہ خود برگساں نے اس بارے میں مزید پیش رفت نہیں کی یا اس نے خود اس موضوع کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔

برگساں کا ایک اور اہم مقالہ 1889 میں فرانسیسی زبان میں ایک جرنل میں شائع ہوا جس کا انگریزی میں ترجمہ Time and Free Will کے نام سے کیا گیا اور اسی تحقیقی مقالے پر اس کو دوسری بار ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا گیا۔ برگساں کی دوسری بہت ہی اہم کتاب Matter and Memory کے عنوان سے 1896 میں شائع ہوئی اور یہ کتاب اتنی مشہور ہوئی کہ اس زمانے کے مشہور دانشوروں نے اپنی توجہ برگساں کی جانب موڑ دی۔ اور اسی تخلیق کی وجہ سے اس کا شمار بھی فرانس کے مفکرین میں ہونے لگا اور اسی تخلیق کی وجہ سے اس کو فرانس کے مایہ ناز اور مشہور تعلیمی ادارے College de France میں ملازمت مل گئی۔ برگساں کہتا ہے کہ یہی موقع اس کی زندگی میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ اس نے اب نہایت سنجیدگی سے اپنے موضوعات پر توجہ مبذول کی۔

برگساں نے لاشعور کا جو مفہوم لیا تھا وہ اس مفہوم سے مختلف تھا جس کے

تحت فرائڈ نے تحلیل نفسی کی بنیاد رکھی اور یہ بات اس وقت اور بھی صاف ہوگئی جب فرائڈ اور برائر کی کتاب شائع ہوئی لیکن برگساں نے اپنے مفہوم کو ہی صحیح سمجھا۔ وہ اس کو وجدانیت کا ایک وسیلہ یا ایک صلاحیت کی شکل میں دیکھتا تھا، اس سلسلے میں اس کے کئی مقالے یونیورسٹی کے جرنل اور ملک کے مشہور جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ وجدانیت کے تعلق سے اس کی بڑھتی ہوئی دلچسپی اور اس موضوع پر مسلسل تحقیق و تجربات میں مصروف رہنے کی وجہ سے اس کو ایک اور اعزاز ملا۔ اس کو لندن میں واقع Society for Psychical Research کا 1913 میں صدر منتخب کر لیا گیا۔ یہ اس کی زندگی میں ایک اور بڑا اسموڑ تھا کیوں کہ اس عہدے پر فائز ہونے کے بعد اس نے اس سوسائٹی کو نیا جوش اور ولولہ دیا، دوسری طرف سوسائٹی کے تحقیقی کاموں میں دلچسپی لینے کی وجہ سے اس موضوع پر اس کو کافی عبور حاصل ہو گیا اور وجدانیت پر اس کے کام کو ہر جگہ سراہا گیا اور اس کی شہرت یوروپ سے لے کر امریکہ تک پہنچ گئی۔

1907 میں اس کی کتاب "Creative Evoluation" شائع ہوئی تو پورے فرانس میں اس نے فلسفہ سے متعلق تمام شعبوں میں ایک دھوم مچا دی۔ اس کی اس کتاب کی وجہ سے ہی اس کا نام ملک کے مشہور اور مقبول دانشوروں کے ساتھ شمار کیا جانے لگا۔ حالاں کہ اس کتاب کے بعض حصوں پر اعتراضات کا سامنا بھی ہوا۔ جب بلند پایہ فلسفی برٹرینڈ رسل بھی اس پر تنقید کرنے والوں کے ساتھ مل گیا۔ اس نے برگساں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ برگساں ہم سب کو کیڑے مکوڑوں میں تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ اس نے یہ فقرہ اپنے مقالے میں برگساں کے مضمون Nature of Intution پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ برگساں کو ایک فلسفی تسلیم کرنا ہی غلط ہے کیونکہ اس کے خیالات تجربہ، فطرت اور حقیقت پسندی کے خلاف جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود جب برگساں کبھی لیکچر دیتا تھا تو ہال کھچا کھچ بھرا ہوتا تھا اور سامعین میں شہر کے فلسفے کے طلبہ ہی نہیں بلکہ مشہور ہستیاں بھی شامل ہوتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ فرانس کا مشہور شاعر ٹی.ایس. ایلیٹ بھی برگساں کے پرستاروں میں شامل تھا۔

1913 میں برگساں امریکہ بھی گیا اور وہاں اس نے کولمبیا یونیورسٹی میں Sprituality and Liberty کے عنوان کے تحت ایک لیکچر دیا جو امریکہ کے علمی حلقے میں کافی پسند کیا گیا۔ امریکہ کے مشہور روزنامہ نیویارک ٹائمز نے اس لیکچر کی پذیرائی میں ایک بہت ہی جامع مضمون شائع کیا جس میں برگساں کی دل کھول کر تعریف کی گئی تھی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ برگساں کی شہرت امریکہ کے کونے کونے میں پہنچ گئی اور جب اس کے دوسرے لیکچر کا اعلان ہوا تو عوام میں اس قدر جوش و خروش پایا گیا جو امریکہ کی علمی دنیا میں اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ تاریخ میں یہ پہلا موقع دیکھنے میں آیا جب اس لیکچر ہال میں پہنچنے کے لیے ہر شخص کوشاں نظر آتا تھا اور وہاں جانے والوں نے براڈوے نام کی شاہراہ پر ٹریفک کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس طرح کی ٹریفک اس شاہراہ پر اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

امریکہ میں اس کی شہرت کی خبریں جب فرانس پہنچیں تو ان کی وجہ سے برگساں کی اہمیت میں اب اور بھی اضافہ ہو گیا اور اس کا احساس فرانس کی حکومت کو بھی ہوا۔ پہلی جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی فرانس کی حکومت نے برگساں کی مقبولیت سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے اس کو اسپین میں فرانس کا سفیر بنا کر بھیج دیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد ہی اس کو فرانس کی حکومت نے امریکہ بھیج دیا کہ وہ صدر امریکہ ولسن سے ملاقات کر کے امن کی کوششوں کو آگے بڑھائے۔ وہ خود کہتا ہے کہ پہلی بار جب میں امریکہ گیا تھا تو اس وقت ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے کوششوں کا مرکز واشنگٹن میں ہی ہے۔ اور دوسری بار جب حکومت فرانس کے نمائندے کی حیثیت سے وہ امریکہ گیا تو اس نے کہا 'میں نے اپنی زندگی کی چند ناقابل فراموش ساعتوں میں انسانیت کا ایک شاندار اور امید افزا روپ دیکھا۔ فرانس کو بچا لیا گیا اور یہ میری زندگی کے عظیم ترین اور پر مسرت لمحات ہیں۔'' برگساں کی زندگی میں امریکہ کے اس دورے کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ وہ امریکہ کی حکومت کے ساتھ League of Nations جیسی عالمی تنظیم کے قیام کے منصوبے پر غور کرنے کے لیے پریزیڈنٹ ولسن کے ساتھ ساتھ تھا اور جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا کہ اس تنظیم نے عالمی امن کے لیے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ اس طرح برگساں کی شہرت اب فرانس کی سیاست میں بھی آسمان چھونے لگی اور وہ بحیثیت ایک نامور فلسفی ہی نہیں بلکہ ایک دور اندیش اور ماہر سیاست داں کی شکل میں بھی پہچانا جانے لگا۔

1925 کے بعد برگساں کی صحت خراب رہنے لگی اور وہ شدید قسم کے وجع المفاصل کا شکار ہو گیا جس کی وجہ سے اس نے عوامی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنا تمام وقت فرانسیسی ادب اور فلسفے کی ترویج و ترقی میں گزارنے کا ارادہ کر لیا۔ 1927 میں اس کو لٹریچر میں نوبل پرائز سے نوازا گیا اور اس کی وجہ سے وہ پھر ایک بار خبروں میں رہنے لگا۔ یہی وجہ تھی کہ

بیمار ہونے کے باوجود وہ اپنے اندر ایک نئی توانائی محسوس کرنے لگا اور اس نے چار سال کی مسلسل محنت کے بعد اپنی آخری معرکۃ الآرا تصنیف The Two Sources of Morality and Religion کے نام سے شائع کی اور اس کی اس تخلیق نے پھر اس کو ملک کے مقبول اور قابل فخر مفکرین کے درمیان لا بٹھایا۔ مذہب سے متعلق اس کے فلسفہ پر پھر بحث ہونے لگی ساتھ ہی اس کے فلسفیانہ خیالات بھی زیر بحث آنے لگے جس کی وجہ سے اس وقت کے فلسفہ کے طلبہ کے ذہن پر بھی اس نے نشانات قائم کر لیے۔

1934 میں اس کے مقالات کا مجموعہ Creative Minds کے نام سے انگریزی میں پھر شائع ہوا اور کافی مقبول ہوا۔ برگساں 81 سال کی عمر میں 3 جنوری 1941 کو انتقال کر گیا۔ اس کے بارے میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں کیتھولک مذہب اپنا لیا تھا لیکن اس بات کی تردید اس بات سے ہو جاتی ہے کہ اس کی موت کی وجہ شدید نزلہ اور زکام کا حملہ بتائی جاتی ہے اور یہ بھی مشہور ہے کہ اس بیماری کا حملہ اس پر اس وقت ہوا تھا جب وہ پانچ گھنٹے تک اپنے آپ کو یہودی شہریوں کی فہرست میں اندراج کرانے کے لیے قطار میں کھڑا رہا۔ ایک اور اہم بات یہ ہے کہ اس نے 1930 میں ایک وصیت تیار کی تھی جس میں یہ لکھا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے تمام کاغذات اور مسودے ضائع کر دیے جائیں۔ لہٰذا اس کی وصیت کا احترام کرتے ہوئے اس کی بیوی نے اس کے تمام کاغذات آگ کے حوالے کر دیے اور ان میں اس کی ایک کتاب کا نامکمل مسودہ بھی شامل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پیرس کی لائبریری میں اس کی یاد میں قائم کیے گئے گوشے میں کوئی دستاویز موجود نہیں بلکہ وہاں اس کی ذاتی لائبریری میں موجود کتب اور اس کی تصنیفات ہی موجود ہیں یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے دوسرے نصف کے مفکرین اور دانشوروں کے لیے برگساں کے بارے میں جاننے کے لیے کچھ زیادہ مواد نہیں ہے۔

برگساں کے کام کا مختصر جائزہ لیا جائے تو اس کا پہلا مقالہ جو فرانسیسی زبان میں تھا کافی مقبول ہوا۔ بعد میں اس کا ترجمہ انگریزی زبان میں TIME and FREE WILL کے نام سے کیا گیا۔ اس مقالے میں برگساں نے کانٹ پر تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اس نے زماں و مکاں (Time & Space) کے فرق کو صاف طرح واضح نہیں کیا بلکہ ان دونوں کو الجھا دیا ہے۔ جس کی وجہ سے ہر فرد فطری عمل کا پابند تسلیم کر لیا جاتا ہے جبکہ برگساں کے خیال میں Time اور Space میں فرق کرنا بہت ضروری ہے تاکہ دونوں کو الگ الگ رکھ کر ان پر بحث کی جا سکے۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ کانٹ کے ہاں شعوریت کا مفہوم بھی واضح نہیں ہے۔ شعوریت سے متعلق معطیات زمانی ہوتے ہیں اور اس کے خیال میں اس نکتہ کو تسلیم کرنے کے بعد ہی ہم اپنے ارتقا کا تجربہ کر سکتے ہیں۔ اس نے اپنے مقالے میں مقداری کثرتیت اور کیفیتی کثرتیت کے فرق کو بھی واضح کیا ہے۔ اس کی مثال وہ بھیڑوں کے ایک جھنڈ سے دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب ہم بھیڑوں کے ایک جھنڈ کو دیکھتے ہیں تو سب ایک ہی جیسی ہونے کی وجہ سے ہمیں ادراک ایک جھنڈ کا ہوتا ہے یعنی بھیڑوں کا ایک گروپ، جس کا مطلب ہے کہ مقداری کثرتیت ہمیشہ Homogeneous (جس کے لیے اردو میں ہم قسم یا ہم نوع کی اصطلاح استعمال کی جا سکتی ہے) جب کہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ باوجود ان کی ہم نوعی کی خصوصیت کے، ہم ان بھیڑوں کو الگ الگ رکھ کر ان کا شمار بھی کر سکتے ہیں کیوں کہ ہر بھیڑ ایک مکانی حقیقت ہے۔

اس طرح ہمدردی یا ہمگدازی کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے لکھا تھا کہ حالاں کہ اس جذبے کا اظہار بہت آسانی سے کیا جا سکتا ہے لیکن صحیح معنوں میں اس کا احساس بہت مشکل عمل ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتا ہے کہ ہمدردی کا احساس اس وقت ہوتا ہے جب ہم اپنے آپ کو اس فرد کی جگہ رکھ کر ان حالات کو محسوس کریں جن کو وہ محسوس کر رہا ہے اور اسی طرح اس درد یا دکھ کا احساس کریں جس سے وہ گزر رہا ہے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جب ہم اپنے آپ کو دوسروں کی جگہ رکھ کر سوچیں تو بعض منفی احساسات بھی پیدا ہو جائیں جو ہمارے اندر دوسروں کے تئیں نفرت کے جذبے کی بنیاد بن جائیں۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ اس کے باوجود ہم دوسروں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں اگر ایسا نہ کریں تو ہم دوسروں کی ہمدردی نہیں حاصل کر سکیں گے جب ہمیں اس کی ضرورت ہوگی، اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں دکھی اور دردمندوں کی مدد کرنا ہماری اپنی ضرورت ہے، اس طرح اگر سوچیں تو ہمارے ذہن میں ہمدردی کا جذبہ اپنے منفی پہلو کے ساتھ سامنے آئے گا۔ اس کا فلسفہ تھا کہ رحم کا اظہار تذلیل نفس اور منفی آرزو کو جنم دیتا ہے ساتھ ہی یہ منفی آرزو فرد میں برتری کے احساس کی بنیاد بن جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ احساس مقداری ترقی کی حیثیت رکھتا ہے کیوں کہ اس میں ناپسندیدگی خوف میں تبدیل ہو جاتی ہے اور خوف ہمدردی کے جذبے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پھر ہمدردی شرمندگی اور پستی کا باعث ہوتی ہے۔ اس طرح اس نے وضاحت کی کہ گو احساس میں غیر یکسانیت پائی جاتی ہے۔ پھر بھی مختلف احساسات ایک دوسرے کی تردید نہیں کر سکتے۔ اس نے اپنے ایک مضمون Introduction to Metaphysics میں ایک لفظ استعمال کیا

ہے جس کو اردو میں وجدان ہمدردی کہہ سکتے ہیں وہ کہتا ہے کہ صحیح معنوں میں ہم احساسیت کا مطلب اس وقت تک واضح نہیں ہوتا جب تک ہم خود اپنے آپ کو ان حالات میں تصور نہ کریں جن حالات سے دوسرا فرد گزر رہا ہے جس سے ہمدردی کا اظہار کر رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اپنے آپ کو اس جگہ تصور کر کے درد محسوس کرنا الگ بات ہے اور اپنے آپ کو آس پاس رکھ کر کسی دوسرے کے درد کے احساسات کا مطالعہ کرنا الگ بات ہے اس کا یہ بھی خیال تھا کہ حالات میں شامل ہو جانے سے ایک الگ قسم کا احساس پیدا ہوتا ہے جسے مطلق احساس کہتے ہیں۔

برگساں کا مشہور قول ہے کہ جیسے جیسے ہماری عمر بڑھتی ہے ہمارا مستقبل مختصر ہو جاتا ہے اور ماضی طویل تر۔ اس کا یہ خیال امتداد (Duration) کی وضاحت کرتے وقت آیا۔ وہ کہتا ہے کہ ہر لمحہ ہمارے لیے ایک تجربہ ہوتا ہے۔ جو لمحہ گزر جاتا ہے وہ ماضی میں چلا جاتا ہے اور موجود لمحے کے مد مقابل بھی نہیں ہوتا۔ وہ کہتا ہے کہ شعوریت میں دو لمحے یکساں ہو سکتے ہیں لیکن ہمارے ذہن میں وہ یکسانیت باقی نہیں رہتی۔ اس سلسلے میں مزید دلیل دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ خازنیت کے اصول کے تحت ہر لمحہ جو ماضی میں چلا جاتا ہے وہ ہمارے حافظے میں محفوظ ہو جاتا ہے کیوں کہ ہمارا حافظہ ماضی کے واقعات کا خزانہ ہے اور یہ خزانہ مختلف تجربات پر مشتمل ہوتا ہے۔ دو تجربات یکساں نہیں ہوتے، ہر لمحہ ماضی کے خزانہ میں اضافے کا باعث ہوتا ہے چوں کہ ماضی طویل تر ہو جاتا ہے اس لیے موجود لمحہ کسی بھی صورت میں ماضی جیسا نہیں ہو سکتا۔ وہ مختلف ہوتا ہے گزرے ہوئے لمحات سے بھی اور ان لمحات سے بھی جو آنے والے ہیں۔

اس سلسلے میں Duration کو وضاحت کرنے کے لیے ایک مثال دیتا ہے کہ جس طرح دو چکریوں (یا چرخیوں) کے درمیان ٹیپ گھومتا ہے تو ایک چکری سے اتر کر دوسری چکری پر لپٹتا ہے۔ یہاں ایک چکری ماضی دوسری مستقبل اور ٹیپ بذات خود امتداد ہے۔ اس مثال کا ایک نقص خود اس کے ذہن میں آیا تو اس نے لکھا کہ اگر کوئی یہ کہے کہ چرخی کو الٹا گھما کر گزرے ہوئے ٹیپ کو آنے والے حصے پر چڑھایا جا سکتا ہے تو وہ یہ خیال رکھے کہ یہ مثال وقت کی چرخی سے متعلق ہے جو کبھی الٹی نہیں گھومتی۔ Duration یعنی امتداد کے بارے میں برگساں کے ہاں جو خیال ملتے ہیں ان کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ مختلف العناصر ہونے کی صلاحیت کا نام ہے۔ ساتھ ہی اس کی وجہ سے ماضی کا تحفظ بھی ہوتا ہے۔ برگساں کا یہ خیال حافظے کو ایک نئے انداز میں پیش کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ حافظے کی وجہ سے فرد اپنے تجربات کو اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے اور یہ تجربات مختلف ہوتے ہیں۔

بعض معاملات میں برگساں نے کانٹ پر فوقیت لے جانے کی کوشش کی ہے۔ اس نے لکھا تھا کہ کانٹ کا فلسفہ پیچیدگی پیدا کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ مکمل علم کے امکانات کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ ساتھ ہی اس نے یہ بھی خیال ظاہر کیا تھا کہ مابعد الطبعیات کے متعلق اس کے نظریات نقائص سے بھرے ہوئے ہیں۔ دراصل کانٹ نے وجدانیت کو ایک نیا مفہوم دیا تھا اور اسکو خردمندانہ وجدانیت کہا تھا ساتھ ہی اس کو مابعد الطبعیات کا ایک حصہ بتایا تھا جب کہ برگساں کا خیال تھا کہ وجدانیت کی یہ خصوصیت ہونا چاہیے کہ وہ ہم کو فلسفے کے تمام مکاتب فکر میں جو فرق پائے جاتے ہیں ان سے بالاتر کر دے۔ اس کے خیال میں عقلیت، تجربہ، حقیقت پسندی اور فطرت ایسے مکاتب فکر ہیں جو اس کی نظر میں آپس میں فرق رکھتے ہیں۔

برگساں کے خیال میں کانٹ نے ''اخلاقی فرائض'' کے تحت نظریہ پیش کر کے ایک نفسیاتی سہو انجام دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سوسائٹی میں افراد پر مختلف قسم کی ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں لیکن کوئی فرد کبھی کبھی ان میں سے کسی ذمہ داری کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ چوں کہ وہ اس کو اپنے اوپر بوجھ سمجھتا ہے۔ جب ایسا ہوتا ہے تو اس کے اندر ہی ایک احساس جاگتا ہے کہ اسے اس بارے میں سوسائٹی کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا ساتھ ہی اس کے اندر ایک اپنی اس حرکت کے لیے خود کی مذمت کرنے کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے اور اس طرح اس کے اندر ہی ایک تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کانٹ نے اس حقیقت کو نظر میں نہیں رکھا۔ برگساں نے اس کیفیت کے لیے مزاحمت کی ترکیب استعمال کی ہے وہ کہتا ہے کہ فرد جب کسی ذمے داری سے پہلو تہی کرتا ہے تو ایک نامناسب عمل سرزد ہوتا ہے اور اس کی یہ نامناسب خواہش پوری کرنے کے لیے اس کو سوسائٹی کی جانب سے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس اخلاقی مزاحمت سے ٹکرانے کے لیے وہ جس مزاحمت کا استعمال کرتا ہے اس کو عقلی مزاحمت کا نام دیا جا سکتا ہے۔

برگساں نے اپنے طریقہ وجدانیت کو بے داغ اور علم کا ایک ذریعہ بتایا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وجدانیت ایک قسم کا تجربہ ہے اور اس نے خود اس کو حقیقی تجربے کا نام دیا ہے۔ اس نے اپنے مضمون Introduction to Metaphysics میں وجدانیت کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ایک مکمل وقوف اور علم کا ذریعہ ہے۔ یہاں یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ کانٹ نے عقلی وجدانیت کی اصطلاح استعمال کی ہے ساتھ ہی اس کو مابعد الطبعیات کا ایک

عنصر قرار دیا ہے لیکن برگساں کے خیال میں وجدانیت ایک ایسا ذریعہ ہونا چاہیے جو فلسفہ کے مختلف مکاتب فکر، خاص طور پر، تجربے، تصور یا عینیت، حقیقت کلیات اور عقلیت (یعنی یہ نظریہ کہ علم صحیح کی بنیاد عقل پر ہے) کے فرق سے اوپر لے جائے ایسے مقام پر جہاں ہم ان میں تفریق کو مٹا سکیں۔ برگساں نے نظریہ اور ''نقطۂ نظر'' میں بھی جو فرق ہے اس کو ختم کرنے پر زور دیا۔

ایک اور اہم بات یہ ہے کہ برگساں امریکہ کے نظریہ عملیت Pragmatism سے متاثر نظر آتا ہے اس لیے وہ کہتا ہے کہ ہماری ضروریات اور خواہشات ذہانت کی رہنمائی کرتی ہیں لہٰذا جو معلومات ہمیں حاصل ہوتی ہیں وہ غیر متعلق نہیں ہوتیں اور اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو وہ اپنے اپنے تناظر میں مختلف ہوتی ہیں اس طرح یہ معلومات مختلف عناصر کا مجموعہ ہوتی ہیں جو ہماری تشفی تو کرسکتی ہیں لیکن ان کے وجود کا ہمیں علم نہیں ہوتا اور یہی وہ طریقہ ہے جو ہمیں وجدانیت کا احساس دلاتا ہے۔ اس طرح وہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وجدانیت عام حالات میں اس عمل کو پلٹ دیتی ہے جس کی وجہ سے مختلف عناصر کی تجزیہ کاری میں ایک رکاوٹ پیدا ہوجاتی ہے، برگساں اس عمل کو تجربے کے عمل پر ایک ضرب کاری سمجھتا ہے کیوں کہ اس طرح وہ تجربہ پھر اپنی افادیت سے محروم ہوجاتا ہے اور اس طرح وہ انسانی تجربہ کہلانے کا مستحق نہیں رہتا۔

برگساں کا ایک اور مقالہ Matter and Memory کے نام سے شائع ہوا اور اس کی اشاعت کے بعد ہی فرانس کے ادب اور فلسفے کے میدان میں برگساں کی شخصیت ملک کے مشہور اور نامور مفکرین کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ برگساں نے اس مقالے کے بارے میں خود لکھا تھا کہ یہ واضح طور پر ثنویت پر دلالت کرتا ہے کیوں کہ اس مقالے میں اس نے مادے کی حقیقت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور غیر مادیت پر بھی بحث کی ہے ساتھ ہی اس نے ہمیں خبردار بھی کیا ہے کہ ثنویت پر بحث کے دوران کچھ نظریاتی دشواریاں سامنے آسکتی ہیں۔ فلسفے کی تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تو ادراک کے خیال سے ہی پیچیدگیاں پیدا ہوجانا ممکنات میں سے ہے۔ لیکن برگساں کے خیال میں اس نے اس قسم کی دشواریوں پر قابو پانے کا راستہ بھی اپنے نظریات کے ذریعہ دکھایا ہے۔ وہ اس طرح کہ اس نے پہلے باب میں قطعی ادراک کا نظریہ پیش کیا ہے جس سے اس کا مطلب ہے کہ تخیل سے ہٹ کر اشیا کی حقیقی شکل اس وقت ہماری معلومات میں آسکتی ہے جب وہ معلومات اس اشیا سے متعلق ہوں جس کی شبیہ پیش کررہی ہیں۔ اس سلسلے میں وہ آگے لکھتا ہے کہ ہمیں جس چیز کا احساس ہوتا ہے وہ ایک تمثال (Image) ہوتی ہے اور برگساں کا یہی مفروضہ ہمیں اشارہ دیتا ہے کہ اس نے وجدانیت کو کس نظر سے دیکھا ہے۔ اس نے ادراک کے ذریعہ حقیقت اور تصور کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس مقالے میں اس نے کئی اہم نظریات پیش کیے ہیں جن کو اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

- مادہ وہ چیز ہے جس کے اندر ایک پوشیدہ توانائی ہے جو مادے کو ہمارے احساس میں اپنی ایک شبیہ پیدا کرنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔
- برگساں کے خیال میں تمثال اور شبیہ (Representation) میں ایک نمایاں فرق موجود ہے۔ لیکن یہ فرق فطری نہیں ہے۔ برگساں نے کئی مقامات پر اپنے اس خیال پر زور دیا ہے کہ تمثال اور شبیہ میں فطری تفریق نہیں ہے سوائے اس کے کہ تمثال اس چیز سے کم ہے لیکن اس چیز کی شبیہ سے زیادہ۔ اس طرح اس کم اور زیادہ سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ تمثال اور شبیہ میں جو فرق ہے اس کی پیائش کی جاسکتی ہے۔
- شعوری طور پر جن عناصر کی ہمارے جسم کو ضرورت نہیں انھیں ہم راستے سے ہٹا دیتے ہیں اور جو عناصر ہمارے جسم کو مختلف وظائف ادا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں انھیں محفوظ کرلیتے ہیں۔ شعوری طور پر اگر ہم زندگی کا تصور کرتے ہیں تو یہ تصور ہماری ضرورت اور جہت پر انحصار کرتا ہے۔

نفسیات کے تعلق سے اگر دیکھا جائے تو برگساں کا یہ مقالہ بہت اہمیت رکھتا ہے اس نے اس میں کئی ایسے نظریات پیش کیے ہیں جو نفسیات میں تسلیم کرلیے گئے ہیں۔ برگساں کے خیال میں زندگی پر اعتماد و متضاد احساسات کا مجموعہ ہے۔ یہ احساسات پہلے تو ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں پھر دونوں ایک ہوجاتے ہیں۔ پہلا احساس یہ کہ زندگی ایک زمانی حقیقت ہے جو زمانے کے ساتھ حرکت کرتی ہے اور ماضی میں چلی جاتی ہے اور وہ اپنی یاد چھوڑ جاتی ہے جب کہ دوسرا احساس یہ کہ زندگی ایک مکانی حقیقت ہے جو امتداد کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے اور حافظے میں محفوظ ہوجاتی ہے۔

اسی طرح اس کا ایک اور اہم مقالہ Creative Evolution ہے جس میں حیاتیات کے تعلق سے کئی اہم نظریات پیش کیے ہیں، اس نے اس مقالے میں زندگی اور ارتقائی ظہور کے موضوع پر بحث کی ہے ساتھ ہی اس

نے اس کے تنوع یا تغیر پذیری پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی کو ہم حقیقی زاویوں سے بھی دیکھتے ہیں ساتھ ہی حقیقی ارتقائی منازل کے تعلق سے بھی۔ جب ہم کسی نوع کی زندگی کے بارے میں بحث کرتے ہیں تو ان دونوں زاویوں کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

اس مضمون میں حیاتیات کی تخلیق کے بارے میں اس کے بہت اہم بیانات ہیں۔ وہ اپنے بیانات کو چار حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ پہلا یہ کہ تمام مخلوق کی تخلیق کے پیچھے ایک ہی مشترک تحریک کارفرما ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر نوع کی ارتقائی حقیقت کے تحت اس میں جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ان کو بھی زیر بحث لانا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر تخلیق کے پیچھے تحریک مشترک ہے تو پھر تغیر کے اصول بھی طے شدہ ہونا لازمی ہے۔ تیسرے یہ کہ تنوع کے دو مختلف رجحان جو ارتقا کے ضامن ہوتے ہیں ان کی شناخت جبلت اور اس نوع کی ذہانت کی بنیاد پر کی جا سکتی ہے۔ چوتھے مرحلے کو وہ وجدانیت سے تعبیر کرتا ہے جس کی وجہ سے ہم اپنے پرانے دور میں جا کر اس ابتدائی تخلیقی تحریک کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہیں اور اس کا سہارا لے کر اپنی ترقی کے راستے میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو دور کر دیتے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد برگساں فرانس میں فلسفہ اور ادب کے میدان سے بالکل دور ہوتا گیا۔ جنگ کی وجہ سے فرانس کی عام زندگی غیر معمولی حد تک متاثر ہوئی تھی اور اسی وجہ سے وہاں کی علمی اور ادبی زندگی پر بھی اثرات مرتب ہوئے تھے۔ پھر ایک ایسا دور آیا کہ فرانس میں جدید طرز فکر ابھرنی شروع ہوئی۔ فلسفہ اور ادب سے تعلق رکھنے والے نئی نسل کے مفکرین نے روایتی طرز فکر کو اس لیے نظر انداز کرنا شروع کیا کیوں کہ وہ قدامت پسندی کا رجحان پیدا کرتی تھی اور برگساں کو فراموش کرنے کی یہی ایک اہم وجہ تھی کیوں کہ اس کے ہاں روایتی قدامت پسندی نمایاں نظر آتی تھی۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد جرمن ایک نئی توانائی کے ساتھ ابھر کر آیا تھا اور وہاں کی ترقی کے اثرات اور نئے رجحانات سے فرانس بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور جرمن کے یہی اثرات مسلک برگساں (Bergsonism) کے زوال کا ایک اہم سبب تھے۔

لیکن یہ حالات دیرپا ثابت نہ ہو سکے جلد ہی حالات نے کروٹ لی اور فرانس میں یہ محسوس کیا جانے لگا کہ برگساں جیسے عظیم فلسفی اور قابل سیاستداں کو فراموش کرنے کا اثر یہ ہوگا کہ فرانس کی علمی اور ادبی تاریخ کا ایک اہم باب عالمی افق سے غائب ہو جائے گا اور یہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان ہوگا۔ اس لیے فرانس کے ایک مفکر Saulez نے اس طرف توجہ دی اور برگساں کے فلسفے کو دوبارہ پیش کرنے کا بیڑہ اٹھایا اس نے ایک کتاب خود لکھی اور دوسری کتاب ایک مفکر F.Worms کے ساتھ مل کر مرتب کی اور 2002 میں شائع کی۔ ان دونوں کے اس تحقیقی کام نے برگساں کو پھر فرانس میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی نئی نسل سے روشناس کرا دیا۔

فرانسیسی زبان میں برگساں کی چھ کتابیں ملتی ہیں اور ان کے علاوہ اس کے خطبات اور مقالات بھی ہیں جو مقامی جرنل میں شائع ہوئے۔ برگساں کی تخلیقات کے انگریزی میں جو ترجمے اب تک ملتے ہیں ان کی تعداد 9 ہے۔ اس کی ایک کتاب Key Writings جو انگریزی میں شائع ہوئی اور کافی مقبول ہوئی Keith Ansell pearson نے اپنے ساتھی John Mullarkey کے ساتھ مل کر مرتب کی۔ اس کتاب کی وجہ سے برگساں کے فلسفے کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ یہ کتاب آج بھی دنیا کے مختلف ممالک میں فلسفے کے طلبہ میں مقبول ہے۔ اس کے علاوہ بھی برگساں کے فلسفہ اور علمی ادبی تخلیقات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور جن دانشوروں نے اس کے کام پر اظہار خیال کیا ہے ان میں ولیم جیمس اور برٹرینڈ رسل بھی شامل ہیں لیکن اس کی موت کے بعد اور بیسویں صدی کے اواخر میں برگساں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ یہ کتابیں فرانسیسی زبان میں بھی ہیں اور انگریزی میں بھی۔ ان کی فہرست پر نظر ڈالی جائے تو ان کی تعداد تقریباً ساٹھ تک پہنچتی ہے۔ ان کتابوں میں سب سے زیادہ اہمیت فرانسیسی مفکر Deleuze کی تصنیفات کی ہے۔ وہ بذات خود ایک عظیم دانشور اور فلسفی تھا۔ اس نے برگساں کے فلسفے پر چھ کتابیں لکھی ہیں اور اس نے برگساں کے کام کو پھر ایک نئے روپ میں پیش کیا۔

(نوٹ: برگساں پر جن کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ ہمارے ملک میں آسانی سے دستیاب نہیں ہیں اور کافی تلاش کے بعد بھی کسی لائبریری میں نہ مل سکیں۔ البتہ انٹرنیٹ لائبریری میں ایسی کئی ویب سائٹ ہیں جن میں ان سے متعلق معلومات فراہم کی گئی ہیں اور اس مضمون کی تیاری میں ان سائٹ میں دی گئی معلومات سے استفادہ کیا گیا ہے۔)

609, A.K. Tower, Madina Manzil Comp.
S.V. Road, Goregaon (W)
Mumbai-400062

☐☐☐

سید امتیاز الدین

نوشاد علی — ایک عظیم موسیقار

بیسویں صدی ہندوستان میں سنیما بینی کی ابتدا اور عروج کی صدی تھی۔ فلمی صنعت نے کئی باکمال فنکار پیدا کیے۔ فلم نے موسیقی کے طرز کو بدلا۔ کلاسیکل موسیقی کی جگہ عوامی پسند کے گانے مقبول ہوئے۔ گیت، غزل، کورس کے ساتھ بیک گراؤنڈ (پس منظر) موسیقی کا طریقہ نکلا۔ جس سے فلم کی کہانی کے طربیہ، غمگین اور سنسنی خیز لمحات کی عکاسی میں مدد ملی۔ 1940 کے بعد جن موسیقاروں کو بے پناہ شہرت ملی اور جن کی بنائی ہوئی دھنوں نے ہندوستان گیر مقبولیت حاصل کی ان میں نوشاد علی کا نام سب سے زیادہ اہم ہے جن کو ان کے چاہنے والے 'نوشاد' کے محبت بھرے لقب سے یاد کرتے تھے۔ نوشاد 25 دسمبر 1919 کو پیدا ہوئے اور 5 مئی 2006 کو 87 سال کی عمر میں ممبئی میں انتقال کر گئے۔ نوشاد اپنے ہم عصر عہد ساز موسیقاروں کی آخری یادگار تھے۔ ایک زمانہ تھا کہ نوشاد کا نام کسی بھی فلم کی کامیابی کا ضامن سمجھا جاتا تھا۔ انھوں نے زیادہ تر فلموں کی موسیقی محبوب خاں اور اے. آر. کاردار کے لیے ترتیب دی تھی۔ شکیل بدایونی، مجروح سلطان پوری، خمار بارہ بنکوی اور دوسرے کئی شاعروں نے ان کے لیے گانے لکھے۔

نوشاد 1930 میں لکھنؤ سے ممبئی فلموں میں اپنی قسمت آزمانے کے لیے آئے۔ انھوں نے 1940 میں فلم پریم نگر سے اپنے فلمی کیریئر کی شروعات کی۔ 1942 میں ان کی فلم شاردا کی موسیقی ترتیب دینے کا موقع ملا۔ اس فلم میں ثریا نے ''انکھیا ملاکے'' اور ''ساون کے بادلو اُن سے یہ جا کہو'' جیسے مقبول نغمے گائے۔ فلم ''رتن'' کی موسیقی نے ان کو بہت اعلیٰ مقام پر پہنچا دیا۔ ان کو اس فلم کی موسیقی کا معاوضہ پچیس ہزار روپے ملا جو اس زمانے میں بڑی بات تھی۔

فلم ''شاہ جہاں'' میں کے. ایل. سہگل نے ان کی دھنوں پر اپنی دل نشیں آواز میں نغمہ سرائی کی تھی۔ سہگل کی وصیت کے مطابق اسی فلم کا ایک گانا ''اب جی کے کیا کریں گے'' ان کی ارتھی کے جلوس کے ساتھ بجایا گیا تھا۔ فلم ''بیجو باورا'' میں ایک بھجن ''من تڑپت ہری درشن کو'' اس قدر پر اثر تھا کہ اس وقت کے راشٹرپتی ڈاکٹر راجندر پرساد کو جب یہ فلم خصوصی طور پر دکھائی گئی تو اس بھجن کے وقت وہ احتراماً کھڑے ہو گئے۔ فلم ''مغل اعظم'' جو آج بھی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے نوشاد کی موسیقی کا شاہ کار ہے۔ یہ فلم جہاں اپنے قیمتی سیٹس، لاجواب ڈائرکشن، پرتھوی راج کپور اور دلیپ کمار کی بے مثال اداکاری اور مدھو بالا کے حُسن و جمال کی وجہ سے یادگار زمانہ بن گئی ہے وہیں اس فلم کو جاوداں بنانے ہیں نوشاد کے لافانی نغموں کا بھی اتنا ہی دخل ہے۔ ''موہے پنگھٹ پہ نند لال چھیڑ گیو رے'' ''پیار کیا تو ڈرنا کیا'' جیسے گیت جب بجتے ہیں تو چلنے والوں کے قدم رک جاتے ہیں۔ موسیقی سے شغف رکھنے والا کوئی بھی شخص ان نغموں کی دل آویزی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی فلم کی ایک نعت شریف ''بے کس پہ کرم کیجئے'' جو فلم میں بعد میں شامل کی گئی تھی نہ جانے کتنوں کو رلا چکی ہے۔

نوشاد نے موسیقی میں نئے نئے تجربات کیے تھے۔ انھوں نے مغربی موسیقی کے حسن کو مشرقی موسیقی میں سمویا۔ کلاسیکی طرز کو جدید آسان اور دلکش انداز میں پیش کیا۔ مغربی سازوں جیسے اکارڈین مینڈولین وغیرہ کو ستار اور بانسری کے ساتھ ہم آہنگ کیا۔

فلم ''بیجو باورا'' میں انھوں نے استاد امیر خان، پنڈت وشنو دگمبر پلسکر کی آواز کا استعمال کیا۔ مغل اعظم میں انھوں نے بڑے غلام علی خاں صاحب کو گانے پر آمادہ کیا۔

موسیقی سے نوشاد کو جنون کی حد تک لگاؤ تھا اور یہ لگاؤ بچپن سے تھا۔ وہ کتابیں لے کر اسکول کے لیے نکلتے لیکن اسکول جانے کے بجائے ساز بجانے کی مشق میں لگ جاتے۔ ان کے والد وحید علی جو کورٹ میں منشی تھے بیٹے سے سخت ناراض رہتے لیکن نوشاد بھی دھُن کے پکے تھے۔ موسیقی سے یہ والہانہ شیفتگی انھیں ممبئی لے آئی۔ یہاں وہ فٹ پاتھ پر سوئے، فاقے کیے لیکن بالآخر ایک دن اس منزل پر پہنچے جس کی آرزو میں انھوں نے گھر چھوڑا تھا۔ نوشاد تاحیات سنگیت کی خدمت کرتے رہے۔ ان کی آخری فلم اکبر خاں کی تاج محل تھی جس کی ریلیز کے لیے وہ پاکستان جانا چاہتے تھے۔

لتا منگیشکر اور محمد رفیع کی آواز کو نکھارنے میں نوشاد کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔ ''انداز'' کے ایک گانے کے لیے انھوں نے لتا سے بیس دن تک ریہرسل کروائی تھی۔ ان دونوں فنکاروں کے بعض شاہ کار نغموں کی دھنیں نوشاد کی بنائی ہوئی ہیں۔ رفیع کے نغمے سہانی رات ڈھل چکی، مدھوبن میں رادھیکا، نین لڑ جائیں تو، میرے محبوب تجھے میری محبت کی قسم نوشاد کی میوزک کی یادگار

رہیں۔ اسی طرح لتا کے کئی یادگار گیت جیسے دو ہنسوں کا جوڑا، دنیا میں ہم آئے ہیں تو، اگر دنیا چمن ہوتی وغیرہ بھی نوشاد کے سنگیت کا کرشمہ ہیں۔ نور جہاں کے مشہور گیت 'آواز دے کہاں ہے' کی دھن بھی نوشاد کی بنائی ہوئی ہے۔ نوشاد نے اوما دیوی سے "افسانہ لکھ رہی ہوں دل بے قرار کا" جیسا گیت گوایا تھا۔ پھر نوشاد کے مشورے ہی پر اوما دیوی نے مزاحیہ اداکاری شروع کی۔ اوما دیوی کو ٹن ٹن کا نام بھی نوشاد کا تجویز کردہ تھا۔

نوشاد کی موسیقی کی ایک خاص بات یہ تھی کہ ان کے اکثر نغمے یک لخت مقبول نہیں ہوتے تھے بلکہ آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرتے تھے اور پھر ہمیشہ کے لیے دل نشیں ہو جاتے تھے۔ 1970 کے بعد فلمی موسیقی کا انداز یکسر بدلنے لگا اور بے ڈھنگے پن کا چلن شروع ہو گیا۔ نوشاد کو اس بات کا بہت دکھ تھا چنانچہ ان کا ایک شعر ہے۔

آبادیوں میں دشت کا منظر بھی آئے گا
گزرو گے شہر سے تو مرا گھر بھی آئے گا

1970 کے بعد نوشاد نے بہت کم موسیقی ترتیب دی۔ 1990 میں انھوں نے سنجے خاں کی "ٹیپو سلطان کی تلوار" کے لیے موسیقی تیار کی تھی۔

نوشاد نہایت منکسر المزاج انسان تھے۔ ان کے تمام احباب نے ان کی شرافت اور حسن اخلاق کا اعتراف کیا ہے۔ ایک بار انھوں نے میری درخواست پر اپنی دستخط شدہ تصویر بھیجتے ہوئے لکھا تھا۔

"آپ کی فرمائش پر ایک بیکار سا فوٹو بھیج رہا ہوں۔ چونکہ میری صورت ہی ایسی ہے اس لیے آپ اس تصویر کو قبول کر لیں۔ آپ کا دعا گو

نوشاد علی[1]

20 اپریل 1998

نوشاد جیسے فن کار صدیوں میں کبھی پیدا ہوتے ہیں۔ انھوں نے صرف فلموں کی میوزک نہیں دی بلکہ ہندوستانی موسیقی کے شائقین کی ذہنی تربیت کی اور ساز و آواز کے رشتے کو مضبوط کیا۔

1. متذکرہ خط کی فوٹو کاپی مع فوٹو گراف ادارے کو موصول ہو گئی ہے۔ (ادارہ)

3-5-805, Hyderguda
Raj Reddy Marg, Hyderabad-500 029.

□□□

اقبال کی کہانی

مصنف: جگن ناتھ آزاد

اقبال وہ عظیم شاعر اور فلسفی ہے جسے عالمی ادب کے منظر نامے میں اہم مقام حاصل ہے۔ شاعر اور فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شگفتہ مزاج انسان بھی تھے۔ ان کی علمی اور ادبی بحثوں سے بڑے باریک نکتے، اسرار اور لطیفوں کے چمن زار کھلتے تھے۔ اقبال کو اپنے ملک و قوم کے بچوں کے مستقبل سے والہانہ لگاؤ ہی تھا جس کے سبب انھوں نے بچوں کے لیے مضامین لکھے اور خوب صورت نظمیں کہیں جنھیں پڑھ کر بچے اچھے شہری بن سکتے ہیں۔ جگن ناتھ آزاد نے، جنھوں نے اپنی پوری زندگی اقبال کی حیات اور شاعری کی چھان پھٹک کے لیے وقف کر رکھی تھی، اس کتاب میں اقبال کا جامع تعارف کرایا ہے۔

صفحات: 83، قیمت: -/11 روپے

جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن

مصنف: ظفر محمود

جوش ملیح آبادی اردو شعر و ادب کا ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے نہ صرف شاعری کو خوب صورت زبان عطا کی بلکہ نثر میں بھی گل کاری کی ہے۔ ان کے شعر و ادب کے مطالعے سے خود اعتمادی، جوش اور اپنے ملک و تہذیب کی بقا کے لیے سینہ سپر ہونے کا پیغام ملتا ہے۔ نہ صرف ان کا فن بلکہ خود شاعر کی زندگی کے حالات اس پیغام کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ ظفر محمود نے "جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن" میں شاعر کی زندگی اور فن کے انھی گوشوں کو اجاگر کیا ہے جن سے نئی نسل کی ذہنی و علمی تربیت ہوتی ہے۔

صفحات: 105، قیمت -/38 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 066 110

سرور یوسف

نوشاد

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

علمی، ادبی اور تہذیبی قدروں کے شہر لکھنؤ میں پیدا ہونے والے عظیم موسیقار نوشاد کا 5 مئی کو سوا نو بجے دل کی دھڑکن بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ وہ 86 برس کے تھے۔ انھیں دل کی تکلیف کی وجہ سے 20 اپریل کو ناناوتی اسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ ان کی انجیو پلاسٹی بھی ہوئی لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے اور مالک حقیقی سے جا ملے۔ انھیں شام ڈھلے شانتا کروز کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

نوشاد کا پورا نام نوشاد علی تھا۔ وہ لکھنؤ کے قیصر باغ، نیا گاؤں کے ایک متوسط گھرانے میں 25 دسمبر 1919 کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام واحد علی تھا۔ نوشاد علی لکھنؤ ہی میں پلے بڑھے، وہیں سے ہائی اسکول کیا لیکن ان کی تعلیم کا سلسلہ آگے جاری نہ رہ سکا۔ انھیں اپنے ماموں جان الّن میاں کی لاٹوش روڈ پر واقع سازوں کی دکان پر بٹھایا گیا اور انھیں ہارمونیم کی مرمت کا کام سونپ دیا گیا۔

دن رات سازوں کے ساتھ وقت گزارتے، ان کی مرمت کرتے کرتے نوشاد کے اندر موسیقی کی للک پیدا ہو گئی اور ان کی انگلیاں خود بخود ہارمونیم سے ہم آہنگ ہونے لگیں۔ دل میں رقت اور جذبات کا ریلا سا آنے لگا۔ ان کا دل ساز اور آواز کی طرف کھنچنے لگا۔

انھوں نے اپنی اس کیفیت کا ذکر اپنے رشتے کے بھائی وسیع اللہ سے کیا اور دونوں پارسی تھیٹر جانے لگے۔ نوشاد صاحب نے وہاں اپنے ہارمونیم کی موسیقی کا استعمال کیا تو تعریف ملی، حوصلہ بڑھا اور وہ رائل ٹاکیز (موجودہ مہرا سنیما جہاں اب عموماً پرانی فلمیں دکھائی جاتی ہیں) جانے لگے۔ وہاں خاموش فلمیں پردے پر چلتیں اور آرکسٹرا اسکرین کے قریب بیٹھ کر دھنیں بجایا کرتا، ایک موقع وہ بھی آیا جب انھوں نے آرکسٹرا کے ساتھ بیٹھ کر اپنے ہارمونیم کا استعمال کیا۔ یہاں انھیں ساز بجا کر جو تشفی ملی اس نے انھیں فلمی دنیا میں جا کر قسمت آزمانے کے لیے اکسایا۔ اس دوران میں وہ استاد غربت علی، استاد یوسف علی اور استاد ببن صاحب کی شاگردی میں بھی رہے۔ جب انھیں ساز اور آواز کی دنیا میں ناموری حاصل کرنے کے لیے دل نے مجبور کر دیا تو 1937 میں وہ خاموشی سے ممبئی کے لیے نکل پڑے۔

ممبئی کے لیے مشہور ہے کہ وہ اپنے یہاں آنے والوں کو پناہ دیتا ہے، لیکن وہ ان کے صبر و استقلال کا امتحان بھی لیتا ہے۔ محنت اور مشقت بھی کراتا ہے۔ نوشاد کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ انھوں نے وقت کی مار جھیلی، کبھی کھایا کبھی بھوکے رہے، کارٹر روڈ کے فٹ پاتھ پر رات گزاری لیکن ہمت نہیں ہاری، تگ و دو جاری رکھی۔

نوشاد اس وقت کے نامور موسیقاروں سے ملنے کی کوشش کرتے رہے اور آخر ایک روز اس کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ وہ موسیقار مشتاق حسین کے سازندوں میں شامل ہو کر پیانو پر اپنی مشاق انگلیاں دوڑانے لگے۔ بعد ازاں کھیم چندر پرکاش کے معاون بنے، پھر قدرت کی مہربانیاں شروع ہو گئیں۔ اسسٹنٹ میوزک ڈائرکٹر کے طور پر انھیں فلم ''کنچن'' ملی اور 1940 میں آزادانہ طور پر فلم ''پریم نگر'' میں موسیقی دینے کا موقع مل گیا۔

1942 میں انھوں نے فلم ''شاردا'' کے لیے اس وقت کی مشہور اداکارہ مہتاب کے پلے بیک کے لیے اپنی ذمہ داری پر 13 برس کی ثریا کی آواز کا استعمال کیا جو بعد کے دنوں میں مشہور گلوکارہ بنیں۔ اس کے علاوہ نوشاد صاحب نے محمد رفیع اور لتا منگیشکر کو موقع دیا۔ آشا کو آڈیشن کے بعد ہری جھنڈی دکھائی اور ہٹ گیت دیے۔ شمشاد بیگم، مہندر کپور، شانتی ماتھر، اوما دیوی (ٹن ٹن) وغیرہ کو انھوں نے ہی متعارف کرایا۔

ان کی موسیقی میں کندن لال سہگل، جی۔ ایم۔ درانی، مکیش، ہیمنت کمار، منا ڈے، نور جہاں، امیر بائی کرناٹکی، زہرہ بائی انبالے والی، مبارک بیگم نے کیسے کیسے دل کو چھو لینے والے گیت پیش کیے، دنیا ان سے واقف ہے۔

نوشاد کی موسیقی کے جادو نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ بہترین گیت ان کی موسیقی سے سج سنور کر نکلتے رہے اور مقبولیت کی بلندیوں کو چھوتے رہے۔ انکھیاں ملا کے (رتن) ساون کے بادلو (رتن) کیا مل گیا (رتن) آواز دے کہاں ہے (انمول گھڑی) غم دیے مستقل (انمول گھڑی) جب دل ہی ٹوٹ گیا (انمول گھڑی) بچپن کے دن بھلا نہ دینا (دیدار) او دنیا کے رکھوالے (بیجو باورا) آجا میری برباد محبت کے سہارے (انمول گھڑی) مان میرا احسان (آن) دنیا میں ہم آئے ہیں تو (مدر انڈیا) او دور کے مسافر ہم کو بھی ساتھ لے لے (اڑن کھٹولہ) گائے جا گیت ملن کے (میلہ) نین لڑ جئیہیں تو منوا (گنگا جمنا) اپنی آزادی کو ہم ہرگز مٹا سکتے نہیں (لیڈر)، میرے محبوب (میرے محبوب) محبت کی جھوٹی کہانی پہ روئے (مغل اعظم) ڈھونڈو ڈھونڈو رے ساجنا (گنگا جمنا) پیار کیا تو ڈرنا کیا (مغل اعظم) وغیرہ ایسے کتنے گیت ہیں جو دل کے تاروں کو جھنجھنا دیتے ہیں۔

ان کی موسیقی میں اے. آر. کاردار نے اپنی فلموں شاہ جہاں، جادو، درد، دلاری اور دل لگی میں بہت سے دلکش گیت دیے۔ محبوب خاں کی انداز، آن، انمول گھڑی، انوکھی ادا، مدر انڈیا، سن آف انڈیا، وغیرہ فلموں میں نوشاد کی موسیقی نے جان ڈال دی۔ کے. آصف نے نوشاد کے ساتھ مغل اعظم جیسی لازوال فلم بنائی جس کے گیت سن کر ایسا لگتا ہے جیسے ان کی مٹھاس کبھی ختم نہ ہوگی۔

فلمی صنعت جہاں آج ہر معروف موسیقار دو تین سو فلمیں آرام سے کر لیتا ہے، نوشاد صاحب نے 62 سال فلم صنعت میں گزارنے کے بعد صرف 68 فلمیں کیں جن میں 3 ڈائمنڈ جبلی، 9 گولڈن جبلی اور 26 سلور جبلی ہیں۔ پھر بھی وہ اپنی موسیقی میں مزید پرفیکشن اور نکھار لانے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔

اگر چہ ان کی موسیقی میں کوئی خامی نہیں نکالی جاسکتی مگر وہ اپنی آخری فلم "تاج محل" کی موسیقی دیتے وقت بھی کہتے رہے کہ "میری خواہش رہتی ہے کہ میری ہر فلم مکمل ہو، موسیقی کی کسی بھی خامی سے پاک ہو۔"

ان کی مشہور فلموں میں انمول گھڑی (1946) شاہ جہاں (1946)، انوکھی ادا (1947) درد (1947) اعلان (1947) میلہ (1948) انداز (1949) دل لگی (1949) دلاری (1949) بابل (1950) دیدار (1951) بیجو باورا (1952) شباب (1954) اُڑن کھٹولہ (1955) مدر انڈیا (1957) سوہنی مہیوال (1958) مغل اعظم (1960) گنگا جمنا (1961) میرے محبوب (1963) دل دیا درد لیا (1965) پالکی (1967) وغیرہ شامل ہیں۔

نوشاد کے گزر جانے سے ساز اور آواز کے ایک باب کا خاتمہ ہو گیا۔ انھوں نے کسی بھی دور میں اپنی موسیقی کی تبدیلی کے لیے کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔ انھوں نے کلاسکی موسیقی کا دامن کبھی نہیں چھوڑا اور اس پر اپنی گرفت مضبوط رکھی، اسی لیے ان کے گیت امر ہو گئے ہیں۔

نوشاد کو 1953 میں بیجو باورا کے لیے فلم فیئر اعزاز سے نوازا گیا۔ 1982 میں دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے سرفراز کیے گئے۔ یہ کسی موسیقار کو حاصل ہونے والا پہلا دادا صاحب پھالکے ایوارڈ تھا۔ 1984 میں لتا منگیشکر ایوارڈ ملا۔ 1987 میں امیر خسرو اعزاز سے سرفراز ہوئے بعد ازاں 1992 میں انھیں "پدم بھوشن" ملا۔

نوشاد ایک عظیم موسیقار ہی نہیں ایک شاعر، ادیب اور گیت کار بھی تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ عوام صرف ان کی موسیقی سے واقف تھے۔ ان کا ایک شعری مجموعہ "آٹھواں سُر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے "شباب"، "اڑن کھٹولہ"، "میلہ"، "بابل"، "دیدار"، "پالکی"، اور "ساز اور آواز" کی کہانیاں تحریر کیں۔ انھوں نے دو فلمیں "جادو" اور "داستان" بھی پروڈیوس کی تھیں۔

وہ ایک نیک نفس انسان تھے۔ زمین کے آدمی تھے، شہرت اور مقبولیت کی بلندیوں پر پہنچنے کے بعد بھی وہ بالکل نہیں بدلے۔ انھیں جب بھی کوئی ایوارڈ ملتا تو کہتے "عوام کا پیار میرے لیے سب سے بڑا ایوارڈ ہے، انھوں نے مجھ جیسے ناچیز کو عزت بخشی، میری موسیقی کو عزت بخشی یہ میرے لیے بہت بڑی بات ہے۔" ایسی ہی تقریبوں میں یا ادبی نشستوں میں یہ اشعار بھی پڑھتے:

منزل مجھے ملے نہ ملے اس کا غم نہیں
منزل کی جستجو میں مرا کارواں رہے
آبادیوں میں دشت کا منظر بھی آئے گا
گزروگے شہر سے تو میرا گھر بھی آئے گا

جس طرح لوگ آج نوشاد کی موسیقی کے رسیا ہیں اسی طرح گزرے چالیس، پچاس سال پہلے بھی ہر خاص و عام ان کی موسیقی کا دیوانہ تھا۔ اپنے وقت کے مشہور و معروف اداکار اور گلوکار کے. ایل. سہگل جب بیمار پڑے تو انھوں نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ ان کی خواہش ہے کہ جب وہ مریں تو ان کی ارتھی کے ساتھ فلم "شاہ جہاں" کا یہ گیت بجے "جب دل ہی ٹوٹ گیا تو ہم جی کے کیا کریں گے۔" 18 جنوری 1947 کو جالندھر میں جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی ارتھی کے ساتھ شمشان گھاٹ تک یہ گیت بجتا ہوا گیا۔

موسیقی کا وہ شہنشاہ آج ہمارے درمیان نہیں ہے۔ سمندر کی لہروں کے شور اور معروف کارٹر روڈ پر مختلف رنگوں سے سجے فلیٹوں کے درمیان نوشاد مرحوم کا سفید رنگ کا "آشیانہ" شان سے سر اٹھائے کھڑا ہے لیکن اندر بڑے ہال میں رکھا پیانو خاموش ہے، میوزک روم میں رکھے ساز و سامان خاموش ہیں۔ ان پر دوڑنے والی انگلیاں اب خاموش ہیں اور یہ خاموشی جیسے کہہ رہی ہے:

موت برحق ہے دنیا فانی ہے
چار دن کی یہ زندگانی ہے

□□□

ترجمہ و ترتیب: فیروز عالم

تاثرات

ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام، صدر جمہوریہ

"جناب نوشاد علی کی موت کی خبر سن کر مجھے گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ وہ ایک بہترین موسیقار تھے۔ ایک تخلیقی فنکار کے طور پر ہمیشہ ان کا احترام کیا گیا۔ ان میں مستقبل کے موسیقی کے رجحانات کا اندازہ لگا لینے کی زبردست بصیرت تھی۔ ان کی موت سے ہم نے ایک عظیم موسیقار کھو دیا۔ ان کی فلموں کی موسیقی ان کی یاد دلاتی رہے گی۔"

بھیروں سنگھ شیخاوت، نائب صدر جمہوریہ

"وہ ہندوستانی موسیقی کے سالار کارواں تھے۔ فلمی گیتوں کے ذریعے کلاسیکی موسیقی کو مقبول عام بنانے میں ان کی خدمات نمایاں ہیں۔ انسانیت اور ہندوستانی موسیقی کے تئیں ان کی بے پناہ محبت کے جذبے کی وجہ سے فلمی دنیا میں نوشاد صاحب کو بہت عزت حاصل تھی۔ ان کی رحلت پورے ملک کے لیے بہت بڑا خسارہ ہے۔"

ڈاکٹر منموہن سنگھ، وزیر اعظم

"نوشاد صاحب کی موت کے ساتھ سُر اور سنگیت کے ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ کلاسیکی موسیقی کے اصولوں کو کسی بھی صورت میں خیر باد نہ کہنے کی ضد کے باوجود نوشاد صاحب کی مقبول عام موسیقی پر زبردست گرفت رہی۔ ان کا انتقال نہ صرف کلاسیکی موسیقی اور فلمی دنیا کے لیے بلکہ ملک کے لیے بڑا نقصان ہے۔"

پروفیسر شمس الرحمن فاروقی، اردو دنیا کی سربرآوردہ شخصیت اور وائس چیئرمین قومی اردو کونسل

"نوشاد صاحب ہمارے عہد کے عظیم موسیقار تھے۔ انھیں موسیقار اعظم کا خطاب غلط نہیں دیا گیا تھا۔ اردو کو فلم کے ذریعے مقبول بنانے میں انھوں نے نمایاں کردار ادا کیا۔ شعر و ادب سے انھیں گہری وابستگی تھی اور ان کا شعری مجموعہ "ساتواں سُر" کے نام سے شائع ہوا۔ "شمع" میں انھوں نے اپنی یادداشتیں تحریر کی تھیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کتنے اصول پسند، ایماندار، مخلص اور ہمدرد انسان تھے۔ ان کی کمی ہمیشہ محسوس کی جائے گی۔ فلمی موسیقی کے میدان میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انھوں نے ہندوستانی کلاسیکی راگوں کا استعمال بڑے سلیقے سے کیا۔ وہ راگ کی ادائیگی میں صحت کا پورا خیال رکھتے تھے۔"

دلیپ کمار، اداکار

"ان کے گزر جانے سے کلاسیکی موسیقی کے ایک دور کا خاتمہ ہو گیا اب موسیقی میں وہ بات کہاں دیکھنے کو ملے گی۔"

لتا منگیشکر، گلوکارہ

"نوشاد صاحب کا انتقال میرے لیے ذاتی نقصان ہے کیوں کہ میں نے ان کی وجہ سے نغمگی کو سمجھا ہے۔ انھوں نے فلمی موسیقی کو نئی جہت دی اور نہ صرف نئے لوگوں کو مواقع فراہم کیے بلکہ ان کے کیریئر کو سنوارنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔"

آشا بھونسلے، گلوکارہ

"میں ان کے پاس آڈیشن کے لیے گئی تھی، انھوں نے میری آواز پسند کی، بہت سے گانے گوائے جو تقریباً سبھی مقبول ہوئے۔ وہ آج کی موسیقی سے ناخوش تھے کہتے تھے کہ یہ گیت دائمی مٹھاس کے حامل نہیں ہیں۔"

خیام، موسیقار

"نوشاد صاحب کی رحلت فلمی دنیا کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ان کی موسیقی کے سامعین کے دلوں میں اتر جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ کسی گیت کی دھن تیار کرنے میں رات دن ایک کر دیتے تھے۔ نوشاد صاحب کا عہد فلمی موسیقی کی تاریخ کا سنہرا عہد تھا۔"

جاوید اختر، شاعر

"نوشاد صاحب ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی زندہ مثال تھے۔ انھوں نے ہندوستانی فلمی سنگیت کو مقبولیت دلائی۔ کلاسیکی موسیقی اور لوک سنگیت کی عوام تک رسائی میں ان کا کردار بے مثال تھا۔"

دھرمیندر، اداکار

"وہ ایک بہت پیارے انسان تھے۔"

ششی کانت کیلکر، "نوشاد کی کہانی نوشاد کی زبانی" کے مراٹھی مترجم

"میں ان سے ان کی موسیقی کے ایک مداح کے طور پر ملا تھا۔ نوشاد صاحب اور ان کی بیگم مجھ سے بہت اچھی طرح پیش آئے حالانکہ وہ مجھے بالکل نہیں جانتے تھے۔ مجھے ان کی ایک ریکارڈنگ یاد آ رہی ہے جس میں 16 وائلن بجائے جا رہے تھے۔ ہم سب لوگوں کو محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی آوازوں میں زبردست ہم آہنگی ہے لیکن نوشاد صاحب نے ایک وائلن بجانے والے کی طرف اشارہ کیا کہ اس کے بجانے میں کچھ خامی ہے۔ وہ ایک نرالے موسیقار تھے۔"

مہیش بھٹ، فلم ساز

"وہ سیکولر ہندوستان کی علامت تھے۔ ان کی روزمرہ زندگی ہندوستانی مشترکہ کلچر کی بہترین مثال تھی۔ ان کی موسیقی اس مشترکہ کلچر کی صدائے بازگشت ہے۔"

بنی ریوبن، صحافی

"آج ہندوستانی موسیقی کا عہد زریں ختم ہو گیا۔ نوشاد ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی موسیقی ہمیشہ رہے گی۔"

ڈاکٹر آر۔ کے۔ بھٹ، مدیر "اردو دنیا"

"نوشاد صاحب اردو تہذیب کے بہترین نمائندے تھے۔ وہ اپنی بات چیت اور روزمرہ کے دیگر مشاغل میں ہر جگہ اردو کا استعمال کرتے تھے۔ وہ تلفظ پر خاص توجہ دیتے تھے۔ بڑے بڑے گلوکاروں سے جن میں محمد رفیع اور لتا منگیشکر بھی شامل ہیں، وہ بار بار ریہرسل کراتے تھے۔ بہتر سے بہتر کر گزرنے کا جذبہ ہی تھا جس کی وجہ سے پچھلے پچاس سال سے ان کے نغمے مقبول ہیں۔ ان میں جو مٹھاس، نغمگی اور تازگی ہے اس کا جادو سامعین کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔ نوشاد صاحب ایک سیدھے سادے اور نیک انسان تھے، دکھاوا اور تکبر ان میں نام کو بھی نہ تھا۔ ان کی انھی خصوصیات نے انھیں ایک عظیم موسیقار کے ساتھ عظیم انسان بھی بنایا۔"

یادگار نغمے

انکھیاں ملا کے جیا بھرما کے چلے نہیں جانا	رتن (1944)
آواز دے کہاں ہے	انمول گھڑی (1946)
آجا میری برباد محبت کے سہارے	انمول گھڑی (1946)
غم دیے مستقل کتنا نازک ہے دل	شاہ جہاں (1946)
جب دل ہی ٹوٹ گیا، ہم جی کے کیا کریں گے	شاہ جہاں (1946)
افسانہ لکھ رہی ہوں دل بے قرار کا	درد (1947)
یہ زندگی کے میلے	میلہ (1948)
گائے جا گیت ملن کے تو اپنی لگن کے	میلہ (1948)
بچپن کے دن بھلا نہ دینا	دیدار (1951)
مان میرا احسان ارے نادان	آن (1952)
او دنیا کے رکھوالے	بیجو باورا (1952)
او دور کے مسافر ہم کو بھی ساتھ لے لے	اڑن کھٹولا (1955)
دنیا میں ہم آئے ہیں تو جینا ہی پڑے گا	مدر انڈیا (1957)
جب پیار کیا تو ڈرنا کیا	مغل اعظم (1960)
محبت کی جھوٹی کہانی پہ روئے	مغل اعظم (1960)
ہمیں کاش تم سے محبت نہ ہوتی	مغل اعظم (1960)
نین لڑ جیہیں	گنگا جمنا (1961)
ڈھونڈو ڈھونڈو رے ساجنا مورے کان کا بالا	گنگا جمنا (1961)
ننھا منا راہی ہوں......	سن آف انڈیا (1962)
آج کی رات میرے دل کی سلامی لے لے	رام اور شیام (1967)
تیری پائل میرے گیت......	تیری پائل میرے گیت (1994)

□□□

مضامین صاف اور خوش خط ارسال فرمائیں۔

(ادارہ)

انجم مانپوری

کرائے کی ٹمٹم

اردو کے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں انجم مانپوری کی تحریر "کرائے کی ٹمٹم" کو قابل قدر مقام حاصل ہے۔ انجم مانپوری بہار کے گیا ضلع میں 1881 میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام نور محمد تھا۔ انہوں نے ندوۃ العلماء لکھنؤ سے تعلیم حاصل کی۔ انجم مانپوری نے تین برسوں تک مولانا ظفر علی خاں کے اخبار روزنامہ "زمیندار" کی ادارتی ذمہ داریاں نبھائیں۔ لاہور سے گیا واپس آکر انہوں نے 1931 میں رسالہ "ندیم" نکالا جسے کافی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ انجم مانپوری کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے مجموعوں "طنزیات مانپوری" "مکاتبات مانپوری" اور مرنے کے بعد کو خاصی پذیرائی ملی۔ "کرائے کی ٹمٹم" کے علاوہ "مہر کلو کی گواہی" بھی ان کی ایک لازوال مزاحیہ تحریر ہے۔ انجم مانپوری کا 1958 میں تقریباً 77 سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

شام کو بانکی پور سے گیا جانے والی ٹرین ٹھیک پانچ اور چھ کے درمیان کھل جاتی ہے اور آپ جانتے ہیں کہ میں ہر بات میں بہت زیادہ محتاط واقع ہوا ہوں۔ خاص کر ریل کے معاملے میں، کیوں کہ اول تو یہ اپنے بس کی سواری نہیں۔ دوسرے ادنیٰ، اعلیٰ، بھلے برے کی یہاں کوئی تمیز نہیں۔ آپ ہزار معزز اور اعلیٰ پوزیشن کے ہوں گے، دو منٹ بھی دیر ہوئی اور بغیر انتظار کیے روانہ ہوگئی۔ بعض اوقات بڑے بڑے جنٹل مینوں کو پلیٹ فارم پر پہنچ کر اپنے سامنے ٹرین کھل جانے کا نظارہ حسرت اور غصے کی نظر سے دیکھنا پڑتا ہے۔ ایسی حالت میں آپ ہی کہیے کہ احتیاطاً اگر چار ہی بجے میں نے بستر وغیرہ باندھ کر سڑک تک ٹم ٹم پر اسباب لے جانے کے لیے اپنے میزبان بھائی منظر سے آدمی مانگا تو کیا برا کیا۔ خواہ مخواہ میری اس کارروائی کا تمسخر انگیز مسکراہٹ سے "جلد بازی اور بوکھلاہٹ" کہہ کر مضحکہ اڑا گیا۔ مگر مجھ جیسا دھن کا پکا کب ان باتوں کی پروا کرنے والا تھا۔ خود جھٹ ایک بغل میں بستر اور دوسری بغل میں چھڑی اور چھتری، داہنے ہاتھ میں لوٹا اور بائیں ہاتھ میں ٹفن کیریر لیا اور زور سے سلام علیکم کہہ کر وہاں سے چل دینے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ اپنی جگہ سے کود کر بھائی منظر نے میری بغل سے بستر کھینچ لیا اور ایک دو صاحب جو وہاں موجود تھے، کسی نے ہاتھ سے لوٹا، کسی نے ٹفن کیریر چھینا اور ساتھ ہی منت وسماجت شروع کر دی کہ ناشتہ چائے تیار ہے، اسے چھوڑ کر نہ جانا چاہیے، منت وسماجت وغیرہ چنداں قابل توجہ بات نہ تھی، لیکن ناشتہ چائے کی استدعا کو ان کی دل شکنی کے خیال سے مسترد کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کرہاً نہیں تو طوعاً اسے قبول کرنا پڑا۔ ناشتہ چائے سے جلد جلد فرصت کر کے چلنے کو آمادہ ہوئے تو پھر انھوں نے نہایت متانت کے ساتھ سمجھانا شروع کیا کہ ڈیڑھ دو گھنٹے قبل پہنچ کر پلیٹ فارم پر فضول وقت گزارنے سے کیا حاصل۔ اگر یوں ہی اسٹیشن پہلے پہنچنے کا شوق ہے تو آدھ گھنٹہ قبل ساڑھے پانچ بجے یہاں سے چلے جایئے گا۔ گھڑی دکھلا کر کہا ابھی ساڑھے چار بجے ہیں۔ گاڑی چھ بجے غروب آفتاب کے بعد کھلتی ہے۔ میں نے کہا بھائی صاحب! ان گھڑیوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ کبھی تو آفتاب ڈوبنے کے بہت بعد قریب سات کے چھ بجتے ہیں اور کبھی دن رہتے پانچ بجے کا وقت ہو جاتا ہے۔ کیا معلوم کہ آج کس وقت چھ بج جائیں۔ غرض میں نے بھی ایسا قائل اور لاجواب کر دیا کہ سوائے مسکرا کر چپ رہنے کے کوئی جواب ان سے نہ بن سکا تھا۔ میں نے فاتحانہ انداز سے ملازم کے سر پر اسباب رکھوائے اور سبزی باغ کے نکڑ پر عدالت کے سامنے ٹمٹمستان یعنی ٹمٹم کے اڈے پر پہنچا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی سب یک بان بیک وقت وار دار ٹوٹ پڑے۔ اس طرف آیئے سرکار یہ ٹمٹم حاضر ہے۔ ادھر تشریف لایئے حضور! آپ کے لیے یہ ٹمٹم موجود ہے۔ پچھم دروازہ جایئے گا؟ چوک جایئے گا جناب؟ اس پر آیئے، اس پر آیئے، اسٹیشن چلیے گا میاں صاحب؟ فوراً پہنچاتے ہیں؟ غرض جس کو دیکھیے مجھ کو حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہو گیا۔ کوئی اسباب اپنی ٹمٹم پر رکھوانے کی کوشش کر رہا ہے۔ کوئی میرا بازو تھامے اپنی طرف کھینچے لیے جا رہا ہے۔ اپنی یہ عزت افزائی اور قدردانی دیکھ کر مجھے یہ یقین ہو گیا کہ واقعی آدمی کی قدر اپنے شہر سے باہر ہی ہوتی ہے۔ یک بانوں کے اظہار عقیدت سے میں اس قدر متاثر ہوا کہ کسی کی دل شکنی کی میری ہمت نہ پڑی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرا

اسباب دوسری ٹمٹم پر اور میں بذات خود دوسری ٹمٹم پر جس پر دو صاحب پہلے سے بیٹھے تھے۔ یکہ بان نے کہا کہ یہ دونوں بھی چوک ہی جا رہے ہیں۔ آپ وہاں کس جگہ اتریں گے؟ میں نے کہا ارے بھائی مجھے اسٹیشن پہنچنا ہے ریل کا وقت ہے۔ تجھے چوک ہی جانا ہے تو اسٹیشن ہوتے ہوئے چلے جانا۔ اس نے ہنس کر کہا کہ اسٹیشن یہاں سے پچھم ایک میل اور چوک پورب دو میل ہے۔ بمبئی کے راستے سے کلکتہ جانے کو آپ کہہ رہے ہیں؟ مجبوراً اس سے اتر کر دوسری ٹمٹم پر، جس پر نہ معلوم کس طرح اسباب رکھ دیا گیا تھا، سوار ہونے چلا، پاس ہی بغل میں ایک شخص ٹہل رہے تھے، انھوں نے کہا کہ کہاں آپ ان یکہ بانوں کے پھیرے میں پڑے ہیں۔ آپ کو ٹمٹم پر بٹھلا کر گھنٹوں سواریوں کی تلاش میں ادھر ادھر ٹہلاتے پھریں گے۔ جب تک چار سواریاں پوری نہ ہوں گی یہاں سے ٹلیں گے نہیں۔ مجھے بھی اسٹیشن ہی جانا ہے۔ تھوڑی دیر اسی جگہ پر ٹھہریے۔ جس ٹمٹم پر دو آدمی بیٹھ جائیں، ہم دونوں بھی اس پر سوار ہو جائیں تاکہ زیادہ دیر تک کسی اور ساتھی کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ بات تھی معقول۔ محض معمولی رد و قدر کے بعد سامان ٹمٹم سے واپس لے کر ایک جگہ کھڑا ہو گیا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک ٹمٹم کو دیکھا جس پر دو شخص پہلے سے بیٹھے تھے۔ میں اسی تاک میں تھا ہی، فوراً چل کر بیٹھ جانا چاہیے۔ ورنہ جلد ایسا موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔ لیکن وہ حضرت ایسے ہی تھے۔ فرمانے لگے۔ جناب! اس میں تو ایک دم مریل بڈھا گھوڑا جتا ہوا ہے۔ ابھی ابھی کوئی اچھی ٹمٹم ملتی ہے۔ میں نے کہا۔ قبلہ! ریل کا وقت قریب ہے۔ مجھے تو گھوڑا خریدنا نہیں جو اس کے سن و سال فربہی و لاغری کو دیکھوں۔ اتنی دور اسٹیشن تک پہنچنے کے لیے بہت کافی سن ہے۔ بندہ تو اسی پر جاتا ہے۔ آپ کسی دوسری اچھی سی ٹمٹم پر بعد کو آئیے گا۔ مجھے بضد دیکھ کر اخلاقاً وہ بھی ہمارے ساتھ اس ٹمٹم پر بیٹھ رہے۔ میں نے یکہ بان سے کہا کہ۔ اب چل۔ مگر ذرا تیز ہانکنا ریل کا وقت قریب ہے۔ یہ جملہ ابھی پورا نہ ہوا تھا کہ دونوں جو پہلے سے اس ٹمٹم پر بیٹھے ہوئے تھے ٹمٹم سے اتر پڑے اور ادھر ادھر ٹہلنے لگے۔ میں نے یکہ بان سے بگڑ کر کہا کہ یہ کیا مذاق ہے ریل کا وقت قریب ہے مجھے جانے کی جلدی ہے اور یہ دونوں اطمینان سے چہل قدمی میں مصروف ہیں۔ یکہ بان نے مسکرا کر کہا کہ خفا نہ ہوں، یہ دونوں اسٹیشن جانے والے مسافر نہیں ہیں، ہمارے ملاقاتی ہیں۔ تھوڑی دیر کے لیے میں نے اس غرض سے ٹمٹم پر بیٹھا لیا تھا کہ انھیں دیکھ کر اور مسافر اس پر آجائیں گے۔ آپ گھبرائیں نہیں، ابھی فوراً دو سواریاں بیٹھا کر بات کی بات میں اسٹیشن پہنچاتا ہوں۔ یہ کہہ کر اسٹیشن! اسٹیشن پکارتا ہوا لگا ٹمٹم ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر چکر دینے۔ جیسوں پھیرے لگائے۔ مگر لاغر اور بڈھا گھوڑا دیکھ کر کوئی ادھر متوجہ نہیں ہوا۔ کہیں جانے کے لیے جو اس کے لیے آیا وہ دوسری ٹمٹم پر سوار ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ اگر یہی حالت رہی تو خدا جانے کئی گھنٹے یوں ہی ٹمٹم پر پھیرے لگاتے گزر جائیں گے۔ مجبوراً یکہ بان کے اس کام میں بھی مدد دینے لگا جو سامنے سے گزرا میں نے خوشامدانہ لہجہ میں مخاطب کر کے کہا، کہاں جناب! اسٹیشن جایئے گا؟ اس ٹمٹم پر تشریف لایئے۔ کیوں بھائی صاحب! اسٹیشن کا ارادہ ہے؟ میں بھی تو وہاں جا رہا ہوں۔ آیئے اسی ٹمٹم پر۔ جیسوں راہ چلنے والوں سے اپنے ساتھ ٹمٹم پر بیٹھنے کی درخواست کی مگر اسٹیشن تو کیا اخلاقاً تھوڑی دور تک بھی کوئی ساتھ دینے کو تیار نہ ہوا۔ صرف مسکراتا ہوا سامنے سے گزر گیا۔ یہ تو ہے ہندوستانیوں کے اخلاق اور ہمدردی کا حال اور اس پر چلے ہیں سوراج لینے۔ عاجز آکر جی چاہا کہ اپنا اسباب لیے دیے کود کر جھٹ کسی ٹمٹم پر سوار ہو جاؤں۔ اسی تہیہ میں تھا کہ ایک پنڈت جی نے قریب آکر پوچھا کہ آپ لوگ اسٹیشن جا رہے ہیں؟ یہ سننا تھا کہ آیئے پنڈت جی تشریف لایئے مہاراج کہتے ہوئے ہاتھ کا سہارا دیکر فوراً اپنی ٹمٹم پر کھینچ لیا۔ اب باقی رہا ایک ساتھی اور، تو دل میں سوچا کہ جس خدا نے میری مصیبتوں کو کم کرنے کے لیے بے شان و گمان ایک پنڈت جی کو بھیج دیا۔ اس کی قدرت سے کیا بعید ہے کہ اسی طرح کوئی اور خدا کا بندہ پھنس جائے۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک شخص صاف ستھری دھوتی قمیض پہنے، سر پر لکھنؤ کی قیمتی بیل کی ٹوپی رکھے اور بغل میں دھلے ہوئے کپڑوں کی گٹھری لیے ٹمٹم پر آکر بیٹھ گیا۔ اور کہا کہ اسٹیشن سے اس طرف مسٹر یونس صاحب کی کوٹھی کے پاس اتار دینا۔ میں نے یکہ بان سے کہا اب تو چار سواریاں پوری ہو گئیں۔ خدا کے لیے جلد ہانک۔ ریل کا وقت قریب ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ٹرین چھوٹ جائے۔ ''سرکار ابھی بات کی بات میں پہنچاتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے ایک چچی جس میں ہاتھ ڈیڑھ ہاتھ کی رسی بندھی تھی، آہستہ سے گھوڑے کی دم پر لگائی اور چپکار کر کہا کہ چل بیٹا اسٹیشن ہی پہنچ کر دم لینا۔ مگر گھوڑے نے گویا کچھ سنا ہی نہیں۔ اس کی بے پروائی کو دیکھ کر ایک چچی رسید کرنے کے ساتھ ہی لگام کو زوروں سے جھٹکا دے کر یکہ بان نے کہا بیٹا! دکھا دے تو ذرا ریل کا مزا۔ مگر اس ناخلف بیٹے نے اس پر بھی کچھ دھیان نہ دیا۔ صرف دم ہلا کر اور کان پھٹپھٹا کر رہ گیا۔ اب یکہ بان کو تاب کہاں۔ متواتر پانچ سات چچیاں سٹاک سٹاک زوروں سے لگا کر کہا۔ سالا چلتا ہے یا نہیں۔ میں نے سمجھا کہ بیٹا سے جو سالا بنایا گیا ممکن ہے کہ اس تبدیل رشتہ کا کچھ اثر پڑے۔ مگر وہ سالا بیٹا آگے بڑھنے کے عوض اور پیچھے کی طرف ہٹنے لگا۔ میں نے یکہ بان سے کہا کہ اگر گھوڑا الٹا چلنے کا عادی ہے تو خدا کے لیے اسٹیشن کی جانب سے اس کا

رخ پھیر کر پورب کی طرف کر دے۔ اس طرح پیچھے ہٹنا شاید اسٹیشن پہنچ جائے۔ اس نے کہا حضور! بات دراصل یہ ہے کہ اس کے دانہ کا وقت قریب آگیا ہے اس لیے اپنے گھر کی طرف اڑ رہا ہے۔ ابھی اسے میں درست کیے دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر چابک بازی شروع کر دی۔ مگر گھوڑا بھی عجیب جی دار اور ثابت قدم نکلا۔ ادھر پیٹھ پر سٹاک سٹاک پڑی۔ ادھر اس نے یکہ بان کے پاؤں دان پر جسے ان کی اصطلاح میں ارنی کہتے ہیں، تڑاق سے دولتی جھاڑ دی۔ یکہ بان کے چابک اور گھوڑے کی ارنی دولتیاں جھاڑنے کی یکے بعد دیگرے سٹاک اور تڑاق کی آوازیں دیر تک ہم لوگوں کی سمع نوازی کرتی رہیں۔ یہاں تک یکہ بان کا ہاتھ اور گھوڑے کے پاؤں نے تھک کر تھوڑی دیر کے لیے خود بخود مہلت لے لی۔ یہ حالت دیکھ کر ہم چاروں ٹمٹم کے سیٹنگ ممبروں نے واک آؤٹ کا متفقہ فیصلہ کرلیا۔ سب سے پہلے پنڈت جی نے پیش قدمی کرنی چاہی۔ اسی ارادے سے پاؤں لٹکا کر کودنا چاہتے تھے کہ یکہ بان نے جھٹ ان کی ٹانگ تھام لی اور کہا کہ اگر اس ٹمٹم پر نہ جانا تھا تو آکر بیٹھتے ہی نہیں۔ گھوڑے کو اس قدر پٹوا کر اب چلے دوسری ٹمٹم پر۔ یہ تو اب نہیں ہوسکتا۔ میں نے بگڑ کر کہا کہ ریل کا وقت قریب ہے۔ اس مریل گھوڑے کے پیچھے کیا اپنی ٹرین چھوڑ دوں؟ اس نے کہا میاں صاحب یہ ذرا بیماری کی وجہ سے دبلا اور کمزور ہوگیا ہے۔ ورنہ ایسا جیوٹ کا گھوڑا ڈھونڈے نہیں ملے گا۔ دیکھا نہیں کیسا کس کس کے بیسوں چابک پڑے مگر سوائے دولتیاں جھاڑنے کے چوں تک نہیں کی۔ میں نے کہا مگر ایسا ثابت قدم گھوڑا تو نون وہلنس والعجیر وں کی سواری کے لائق ہونا چاہیے جو ڈنڈے اور ہنٹر کھا کر بھی قدم آگے نہیں اٹھاتا، اس ٹمٹم میں جوت کر خواہ مخواہ ایسے بہادر گھوڑے کی مٹی پلید کی۔ اس نے ہنس کر کہا کہ سرکار میں جھوٹ نہیں کہتا۔ آج ہی صبح جو یہاں سے بجلی کی طرح چلا تو پھلواری ہی جا کر دم لیا۔ اس کی تیزی کا حال دیکھنا ہو تو گھوڑ دوڑ کے میدان میں چھوڑ دیجیے، خدا جھوٹ نہ بلوائے تو ریس کے گھوڑوں سے میری ٹمٹم آگے ہی نظر آئے گی۔ صرف یہی ذرا عیب ہے کہ چلا تو چلا اور اڑا تو اڑا۔ پنڈت جی نے بگڑ کر کہا کہ اس بڈھے گھوڑے کے بدن پر ماس تو ہے نہیں پسلی کی ہڈی تک نظر آرہی ہے اور جھوٹ موٹ تعریف کیے جارہا ہے۔ سفید پوش ساتھی نے پنڈت جی کی ہاں میں ہاں ملائی اور کہا کہ اس سے کہیں اچھا تو میرا گدھا ہے۔ پنڈت جی نے گھور کر دیکھا اور پوچھا کہ تمھارے پاس گدھا کس لیے ہے؟ اس نے کہا گھاٹ پر کپڑے لے جانے اور وہاں سے لانے کے لیے ہم لوگ گدھا ہی رکھتے ہیں۔ پنڈت جی نے اپنا دامن سنبھالتے ہوئے ذرا کھسک کر پوچھا کہ کیا تم دھوبی ہو؟ اس نے کہا جی ہاں۔ مگر اور دھوبیوں کی طرح معمولی نہیں۔ میں اشراف دھوبی ہوں۔ حاکموں اور بیرسٹروں کے کپڑے دھوتا ہوں۔ اتنا سننا تھا کہ پنڈت جی آپے سے باہر ہوگئے۔ غصے میں فرمانے لگے کہ اچھوت دھوبی ہوکر برہمن کے ساتھ بیٹھنے کی ہمت کیسے پڑی؟ ہمارا شہر ہوتا تو اس شوخی کا مزا چکھا دیتے۔ اور پھر ہم لوگوں سے مخاطب ہوکر کہنے لگے کہ آپ لوگوں کو اختیار ہے، چمار، دھوبی جس کو چاہیں ساتھ بٹھلائیں۔ میں شدروں کے ساتھ اپنے کو ناپاک نہیں کرنا چاہتا۔ میں دوسری ٹمٹم پر چلا جاتا ہوں۔ میں نے دیکھا کہ اگر یہ پھنسا ہوا شکار اگر ہاتھ سے نکل گیا تو پھر دوسرے ساتھی کے پھانسنے میں خدا جانے اور کتنی دیر لگے گی اور ریل کا وقت قریب ہے۔ میں پنڈت جی کی خوشامدیں کرنے لگا کہ مہاراج جب اسے چھو چکے تو گھر جا کر نہا دھو کر پاک ہو جایئے گا۔ اس وقت تو ہم لوگوں کو نہ چھوڑیے۔ اس کے علاوہ اچھوتوں کے ساتھ آپ کا برتاؤ اگر گاندھی جی کو معلوم ہوگیا تو برت رکھ رکھ کر ناک میں دم کر دیں گے اور جو کہیں ڈاکٹر امبیڈکر کو خبر لگ گئی تو آپ جانیے شدروں کے یہ گرو گھنٹال کونسل کے علاوہ ٹمٹم پر بھی ریزرویشن پر اڑ جائیں گے۔ ایسے نازک وقت میں آپ کا برسر سڑک چھوت چھات کے قصے کو چھیڑنا کسی طرح مناسب نہیں۔ میں نے سمجھا تھا کہ یہ برہمن نان برہمن کا جھگڑا چلتی گاڑی میں یار کی ہوئی ٹمٹم کے لیے روڑا بن جائے گا۔ بارے خدا خدا کر کے ہماری منت وسماجت پر وقتی مصلحت سے پنڈت جی راضی ہوگئے۔ قریب دس منٹ تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب تک کہ یکہ بان اور گھوڑا پھر تازہ دم ہوگئے۔ اب جو پھر اس نے لگام کھینچ کر چھی چلائی تو بجائے آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے کے گردن موڑ کر اپنے گھر کی طرف رخ کرنا چاہا۔ یہ دیکھ کر پنڈت جی بے ساختہ بول اٹھے کہ گھوڑے کا قصور نہیں یہ یکہ بان ہی اناڑی معلوم ہوتا ہے۔ اتنا سننا تھا کہ آگیا یکہ بان کو تاؤ پوری طاقت سے باگ کھینچ کر گھوڑے کا رخ سیدھا کیا اور چھی لگا کر پنڈت جی کا ڈنڈا لے دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ کر گھوڑے کی پیٹھ پر پانچ سات کس کر اس زور سے جمایا کہ اڑنے اور شرارت کرنے کے بجائے ٹمٹم کو لیے دیے چھلانگ مارتا ہوا اس طرح بھاگا کہ ہم لوگ روکنا، تھامنا لاکھ چلا رہے ہیں مگر وہ وہ اڑا تو اڑا اور چلا تو چلا والا مضمون شاید غلط نہیں تھا۔ اس وقت گھوڑا چلا تو چلا کے عالم میں تھا۔ مجبوراً ٹمٹم کا کنارہ مضبوط پکڑے ہوئے دل میں دعا کرتا جارہا تھا کہ رب العالمین اگر ٹمٹم سے گرنا ہی قسمت میں لکھا ہے تو کم سے کم شہر سے باہر لان کے میدان کے قریب عزت وآبرو کے ساتھ گرانا۔ یہ باکی پور کی بیچ سڑک پر ٹمٹم الٹ جانے سے اپنے زخمی ہونے کا اتنا خیال نہیں جتنا راہگیروں کی بھیڑ اور دکانداروں کے تمسخر انگیز ہمدردانہ جملے۔

ابھی نہ گر جاتے۔ واہ بھئی خوب سنبھل کر گرے۔ خیریت ہوئی کہ آنکھ ناک بچ گئی۔ کوئی پرواہ نہیں۔ گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں۔ یہ نمک برجراحت سے کم نہیں۔ گھوڑا جس بدحواسی کے عالم میں ٹمٹم کو گھسیٹتا اور اٹھا پٹک کرتا ہوا جا رہا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ ٹمٹم پر اسٹیشن تک پہنچنے کے عوض کھٹولی پر اسپتال جانا پڑے گا۔ لیکن خدا جانے کیا ہوا کہ تھوڑی دور جا کر اچانک خود بخود گھوڑا اس طرح کھڑا ہو گیا کہ گویا ٹمٹم کے شوکر نے یکا یک بریک کس دیا۔ ساتھ ہی پٹرول کے بہنے کی آواز کانوں میں آنے لگی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ گھوڑے صاحب دفعہ 34 کی خلاف ورزی میں معروف ہیں۔ یعنی بیچ سڑک پر استنجا فرما رہے ہیں۔ میں نے یکہ بان سے کہا کہ دیکھو دوست ریل کا وقت قریب ہے۔ اس نے برجستہ کہا کہ ابھی بات کی بات میں پہنچاتا ہوں۔ گھوڑا ادھر حوائج ضروری سے فارغ ہوا اور ادھر یکہ بان نے لگام کھینچ کر چھی چلائی۔ مگر چلا تو چلا ختم ہونے کے بعد اب شاید اڑا تو اڑا کا وقت تھا۔ اس لیے ٹمٹم سے فوراً اتر کر یکہ بان نے اس کے تھوتھنے کے پاس لگام پکڑ کر آگے کی طرف کھینچنا شروع کیا لیکن بجائے اس کے گھوڑے کو آگے بڑھائے اس کے اڑنے میں وہ خود اس کے ساتھ تھوڑی دور کھنچا چلا گیا۔ ادھر یکہ بان لگام کا رسہ تھامے اپنی طرف زور لگا رہا تھا، ادھر گھوڑا گردن ٹیڑھی کیے اپنی جانب کھینچ رہا تھا۔ اس ٹگ آف وار کی کشمکش میں گھوڑے کو شرارت سوجھی تو یکا یک الف کھا کر پچھلے دونوں پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ لگام تھامے رہنے کی وجہ سے یکہ بان صاحب بلندی سے مائل بہ بلندی ہو چکے تھے کہ اچانک ہاتھ سے باگ چھوڑ دی۔ ورنہ سرکس کے ایک نئے تماشے کا لطف آ جاتا۔ اب اس کے بعد بھی ایسی ٹمٹم پر بیٹھے رہنے کو ہم لوگوں کی ہمت و جرأت یا حماقت آپ جو چاہیں سمجھیں۔ لیکن آپ یقین مانیں کہ کوئی دقیقہ اس ٹمٹم سے جان چھڑانے کا اٹھا نہیں رکھا گیا۔ مگر وہاں کمبل ہی نہیں چھوڑتی کا قصہ تھا۔ میں نے یکہ بان سے لاکھ کہا کہ ریل کا وقت قریب ہے۔ اپنا کرایہ لے لو اور ہم لوگوں کی جان بخش دو۔ جواب سنیے۔ نہیں صاحب میں مفت خور نہیں کہ بغیر اسٹیشن پہنچائے حرام کا پیسہ لے لوں۔ اگر آج درمیان میں راستے میں آپ کو اتار کر کرایہ وصول کر لوں تو کل کون مسافر میری ٹمٹم پر سوار ہوگا۔

پنڈت جی اس کی باتوں کی پرواہ نہیں کر کے ٹمٹم سے اترنے کی کوشش کرنے لگے تو اس نے بگڑ کر کہا کہ دیکھیے مہاراج آپ کے کودنے سے گھوڑا اگر بھڑکا تو آپ جانیے۔ مجبوراً ڈر سے بیچارے نے اپنا پاؤں اوپر سمیٹ لیا۔ یکہ بان ہم لوگوں کی دل جوئی کے خیال سے کہنے لگا کہ بس اب کے اڑان میں اسٹیشن ہی پہنچے گا۔ اگر اب اس نے شرارت کی تو میں خود دوسری ٹمٹم پر آپ لوگوں کو سوار کرا کر اسٹیشن پہنچا دوں گا۔ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ بیچ راستے میں آپ سب کو چھوڑ کر چلا جاؤں۔ یہ کہتے ہوئے ٹمٹم سے اتر کر گھوڑے کی گردن پر تھاپ مار کر چمکارا اور لگام پکڑ کر آگے کی طرف بڑھاتے ہوئے ہم لوگوں سے کہا کہ ذرا آہستہ سے چابک لگا دیجیے پنڈت جی، جو سب سے آگے بیٹھے ہوئے تھے انھوں نے چابک کے بدلے اپنے ڈنڈے سے خدا جانے کہاں کھونچا لگا دیا کہ یکا یک دولتیاں جھاڑتا ہوا جس رفتار اور جس شان سے چلا ہے وہ حضرت اکبر کے آب دوز کی روانی سے کم نہیں:

بدکتا ہوا اور بھڑکتا ہوا	چمکتا ہوا اور بدکتا ہوا
اچکتا ہوا اور اچھلتا ہوا	وہ کھا کھا کے ٹھوکر سنبھلتا ہوا
ادھر اور ادھر وہ بہکتا ہوا	ادھر رال منہ سے گراتا ہوا
لگام اس طرف وہ چباتا ہوا	ادھر رال منہ سے گراتا ہوا
وہ ہچکولے سب کو کھلاتا ہوا	وہ ٹمٹم کو جھولے جھلاتا ہوا
وہ چابک کی ہیبت سے ڈرتا ہوا	اٹھا کر وہ دم لید کرتا ہوا

غرض اسی شان سے وہ ٹمٹم سنیما کے کچھ ہی آگے پہنچی تھی کہ یکا یک یکہ بان نے لگام زوروں کے ساتھ کھینچ کر گھوڑے کو روکا اور کہا کہ حضور غضب ہو گیا۔ ہم لوگوں نے متفقہ وحشت کے ساتھ پوچھا ارے بھائی کیا ہوا؟ خیریت تو ہے؟ اس نے خوفزدہ انداز میں کہا کہ دیکھیے وہ قصائی سامنے کھڑا ہے۔ آج نہیں چھوڑے گا۔ میں نے کہا خدا کے لیے جلدی بتا کہ تجھ کو یا تیرے گھوڑے کو قصائی سے کیا سروکار۔ اس نے کہا حضور یہ گھوڑے کا ڈاکٹر ہم لوگوں کے لیے قصائی سے کم نہیں اس کے ظلم سے ٹمٹم والے پریشان ہیں۔ کسی گھوڑے کو معمولی سا زخم ہو یا پیٹھ داغی ہوئی اور اس نے رپورٹ کر کے جرمانہ ٹھکوا دیا۔ میرا گھوڑا کئی روز سے ذرا بیمار ہے اور پیٹھ پر معمولی سا زخم بھی ہے۔ پرسوں جو اس نے پکڑا تو منت و سماجت کے بعد اس شرط پر چھوڑا کہ جب تک یہ ایک دم تندرست نہ ہو جائے یہ ٹمٹم میں نہ جوتا جائے۔ آپ ہی انصاف کیجیے کہ ہم جیسے مزدوری پیشہ والے گھوڑے کو بیٹھا کر کہاں سے کھلا سکتے ہیں؟ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سامنے ایک کانسٹیبل غالباً اسی ٹمٹم کی پیش قدمی کے لیے آتا دکھائی دیا۔ وہ لے برندش ٹمٹم ڈاکٹر صاحب کے سامنے پہنچی۔ نظر پڑتے ہی ڈاکٹر صاحب نے ڈپٹ کر سپاہی کو حکم دیا کہ ان سب کو اتار کر گھوڑا کھولو اور ہسپتال پہنچا دو۔ پنڈت جی نے خدا جانے کیا سمجھا کہ لگے ڈاکٹر صاحب سے خوشامدانہ لہجے میں آرزو کرنے کہ ڈاکٹر صاحب اول تو ہم بیمار نہیں۔ اگر آپ کی دانست میں کوئی بیماری ہو تو مجھے یہاں کے ہسپتال میں کیوں بھیجتے ہیں؟ ہمارے شہر میں خود ہسپتال ہے وہیں میں علاج کرا لوں گا۔

ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر کہا کہ آپ بھی عجیب جانور قسم کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے گھوڑے کو ہسپتال بھیجنے کے لیے کہا یا آپ کو؟ ان کے تبسم پر ہماری بھی ہمت بڑھی۔ میں نے کہا کہ جناب ڈاکٹر صاحب! ریل کا وقت قریب ہے۔ خدا کے لیے میری حالت پر رحم کیجیے اور صرف اسٹیشن پہنچانے کی اجازت دے دیجیے۔ اس کے بعد ہسپتال میں اسے بھیجئے یا پوسٹ مارٹم روم میں۔ مجھے کوئی عذر نہیں۔ انھوں نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ یکہ بان بے زبان جانوروں پر اس قدر ظلم کرتے ہیں کہ بعض اوقات دیکھ کر میرا قلب شق ہو جاتا ہے۔ شق القلب جو یکہ بان ان کا لقب دے رکھا تھا اس کی وجہ اس وقت سمجھ میں آئی۔ آخر بہ ہزار خوشامد اسٹیشن تک پہنچانے کی انھوں نے اجازت دی اور سپاہی کو بلا کر کہا تم اسٹیشن تک ساتھ جاؤ وہیں سے گھوڑا کھول کر اسپتال پہنچا دینا۔ ان کی اس مسافر نوازی پر بے ساختہ میری زبان سے دعا نکلی کہ خدا آپ کو ترقی دے کر ہاتھی کا سول سرجن بنائے۔ ڈاکٹر کا حکم پاتے ہی ایک تو ند مند سپاہی صاحب ہاتھ میں ایک لمبی لاٹھی لیے سب سے آگے ٹمٹم پر آ کر بیٹھ گئے۔ اس لیے یکہ بان کو مجبوراً گھوڑے کی باگ ہاتھ میں لیے ساتھ ساتھ پیدل چلنا پڑا۔ میں نے سمجھا تھا کہ اب یہاں بھی اڑا تو اڑا والا مضمون دہرایا جائے گا۔ مگر نہ معلوم پولس کے خوف سے یا سپاہی کے بھاری بوجھ سے جلد چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے گھوڑا بلا عذر دم دبائے ہوئے گردن نیچی کیے خاموشی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہوا۔ ابھی چند ہی قدم گھوڑا چلا تھا کہ یکہ بان نے کہا کہ آگے کی طرف دباؤ زیادہ ہے، ذرا پیچھے ہٹ کر بیٹھیے۔ پہلے سے ہم چاروں ٹم ٹم کے سابق سٹنگ ممبر جہاں جہاں بیٹھے تھے سپاہی جی کی سرکاری سیٹ کے باعث ہم سب کی پوزیشن گڑبڑا گئی۔ پنڈت جی جو آگے صدر کی حیثیت سے بیٹھے تھے ان کو سرکاری مداخلت کے باعث اچھوت دھوبی کے اپوزٹ سائڈ میں جا کر بیٹھنا پڑا۔ اور اب نشست یوں رہی کہ ایک طرف ہمارے پہلے ساتھی اور پنڈت جی، دوسری جانب کپڑے کی گٹھری لیے وہی اشراف قسم کے دھوبی اور آگے یکہ بان کی جگہ وھپ کی حیثیت سے سپاہی صاحب اور بیچ میں یہ خاکسار ناچیز ہیچمدان وغیرہ۔ اب دباؤ کے خیال سے یکہ بان نے پیچھے ہٹنے کو کہا تو سپاہی سرکاری آدمی ہو کر کیوں اپنی جگہ سے ہلنے لگا اور بقیہ تینوں صاحب پچھلی جانب بیٹھے ہی تھے۔ مجھے مجبوراً پیچھے کھسکنا پڑا۔ اپنی جگہ سے ہٹنا تھا کہ یکہ بان نے آواز دی کہ پیچھے کی جانب بوجھ زیادہ ہو گیا۔ ذرا آگے بڑھ جایئے۔ وہاں سے اچانک آگے بڑھ آیا۔ اب ارشاد ہوا۔ اتنا آگے نہیں تھوڑا اور پیچھے ہٹیے۔ مگر پنڈت جی کی طرف نہیں ورنہ الار ہونے کا خوف ہے۔ لاحول ولا قوۃ آگے بڑھیے تو دباؤ۔ پیچھے ہٹیے تو الار۔ ٹمٹم مدھم رفتار سے جا رہی تھی اور میں کبھی ادھر اور کبھی ادھر، آگے کبھی پیچھے اپنی جگہ بدلتا بیلنس درست کرتا جا رہا تھا۔ میری پوزیشن اس وقت ٹھیک مولانا شوکت علی کی طرح ہو گئی تھی۔ کبھی اچھوت کے پاس پہنچا، کبھی سپاہی یعنی سرکاری آدمی کی طرف بڑھا، کبھی پنڈت جی کے پاس کھسک گیا۔ غرض جس طرف جھکا وزن بھاری ہو گیا۔ ہم نے لاکھ کوشش کی کہ کہیں ایسی جگہ جاؤں کہ یہ دباؤ اور الار کا قصہ ہی ختم ہو۔ مگر میں ٹھہرے کی طرح ادھر ادھر لڑھکتا ہی رہا۔ راستے میں چند آزاد منش منچلے لونڈے ادھر سے آ رہے تھے، کانسٹیبل کی نگرانی میں ہم سب کو جاتے دیکھ کر دوسرے نے آواز کسی کہ "صورت تو بھلے آدمیوں کی طرح ہے۔" تیسرے نے قہقہہ لگا کر "اخاہ! ایک پنڈت جی بھی ہیں۔" چوتھے نے گہر افشانی کی۔ "جا تراد یکھ کر چلے ہوں گے اس لیے پکڑے گئے۔" پانچویں نے بیڑی کا دھواں منہ سے نکالتے ہوئے کہا۔ "ارے یار اسباب جو برآمد ہوا وہ بھی ساتھ ہے۔" اتفاق کی بات کہ جیل بھی اسٹیشن کے قریب ہی واقع تھا۔ اب کون سب کو سمجھائے کہ نہیں بھائی، سپاہی نے نہیں بلکہ یکہ بان نے بے قصور ہم لوگوں کو پکڑ لیا ہے۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ ٹمٹم آگے بڑھ گئی ورنہ اور کیا کیا اپنے متعلق قیاس آرائیاں سننے کو ملتیں۔ غصے میں جی تو چاہا کہ ڈیفے میشن (توہین) کا سانحہ سپاہی جی کی معرفت لکھوا دوں۔ لیکن چونکہ ریل کا وقت قریب تھا اس لیے ان باتوں کا زیادہ خیال نہیں کیا۔ آخر خدا خدا کر کے اسٹیشن پہنچا فوراً قلی کو بلا کر پوچھا کہ گیا والی ٹرین جا چکی یا نہیں؟ اس نے کہا بس کھلنے ہی کو ہے جلد چلیے ورنہ ٹرین پھر نہیں ملے گی؟ جھٹ ٹمٹم سے کود قلی کے سر پر اسباب رکھوا سیدھا اس پلیٹ فارم کا رخ کیا۔ پل پر جانے کے لیے سیڑھی پر جونہی قدم رکھا تھا کہ کسی نے زور سے دامن کھینچا۔ مڑ کر دیکھتا ہوں تو یکہ بان کہ رہا ہے کہ واہ میاں واہ! کرایہ دیے بغیر بھاگے جا رہے ہیں۔ جیب میں ہاتھ دے کر دیکھا تو سوائے نوٹ اور روپے کے خردہ ایک پیسہ نہیں۔ میں نے کہا ریل کا وقت قریب ہے، روپیہ بھنا کر دینے کا موقع نہیں۔ اب آکے سود در سود جوڑ کر کرایہ لے لینا۔ مگر وہ کاہے کو ماننے والا تھا۔ ادھر قلی اسباب لے کر آگے بڑھ چکا تھا۔ وہیں سے اس نے پکارا کہ جلدی آیئے ریل چھوٹ رہی ہے۔ ادھر یکہ بان چمٹا ہوا جان چھوڑنے کو تیار نہیں۔ غصہ میں میں نے جیب سے روپیہ نکال کر کہا۔ تیرے پاس خردہ ہے تو اپنا کرایہ لے کے واپس کر۔ اس نے اپنے بٹوے سے ریزگاری گنا تو صرف سات آنے پیسے ٹھہرے۔ اب میں بقیہ پیسہ وصول کرنے کی فکر کرتا یا ریل کو دیکھتا۔ مجبوراً سات آنے پیسے لے کر کہا۔ جا باقی تجھے انعام دیا۔ فوراً خیال آیا کہ اس قدر پریشان کرنے کے بعد میں انعام

دے کر مفت پیسے برباد کرتا ہے۔ اس لیے خیرات کی مد میں دینے کی نیت کی۔ یکہ بان سے پیچھا چھڑا کر ہانپتا کانپتا پل پر پہنچا۔ دیکھا کہ انجن جتا ہوا جانے کے لیے شائیں شائیں کرتا ہے۔ تیز تیز قدم اٹھائے ایک کی جگہ دو دو تین تین سیڑھیوں کو پھاندتا ہوا بدحواس پلیٹ فارم پر جیوں ہی پہنچا کہ گارڈ نے جھنڈی ہلا کر سیٹی بجائی۔ آگے بڑھ کر کسی دوسرے ڈبے میں جا کر اطمینان سے بیٹھنے کا موقع کہاں۔ اسی بوکھلاہٹ میں سیڑھی کے بغل ہی میں جو قریب تر ڈبے تھا گھس گیا۔ وہاں داخل ہوتے ہی زنانہ زنانہ کا ایسا شور مچا کہ سامنے سے ریلوے پولس کے آنے کے قبل ہی وہاں سے نکل کر دوسرے ڈبے کی طرف دوڑا۔ عورتیں واقعی ناقص العقل ہوتی ہیں۔ اس اتحاد و اختلاط کے زمانے میں مردانہ کا فرقہ وارانہ سوال اٹھانا مجھے سخت ناگوار ہوا لیکن ریل کا وقت قریب ہی تھا اس لیے غصہ یا افسوس کے اظہار کا موقع ہی نہ ملا۔ قلی نے پکار کر کہا کہ جلدی بتلایئے۔ اسباب کس خانہ میں رکھوں۔ ٹکٹ کس درجہ کا ہے؟ ٹکٹ کا لفظ سن کر خیال آیا کہ لاحول ولا قوۃ۔ بوکھلاہٹ میں ٹکٹ لینا ہی بھول گیا۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ اگر بوکھلاہٹ بھی نہ ہوتی تو اتنے تنگ وقت میں اس کا موقع بھی کہاں تھا۔ میں نے قلی کو کہا جہاں جی چاہے اسباب رکھ دو۔ دل میں سوچا کہ پروا کی بات نہیں۔ گیا اسٹیشن کے ماسٹر صاحب ملاقاتی ہیں۔ گیٹ پر کون روکے گا۔ تھرڈ، سکنڈ، فرسٹ جس کلاس میں بیٹھ جاؤں گا پاس ہو جاؤں گا۔ یہ سوچ کر سوار ہونے کے لیے ایک ڈبے کی طرف لپکا جا رہا تھا کہ انجن نے سیٹی دی اور گاڑی آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ دوڑ کر چاہا کہ چلتی ٹرین پر چڑھ جاؤں کہ ادھر سے ہاتھ میں سبز جھنڈی، دانت میں سیٹی دبائے خراماں خراماں گارڈ صاحب آ رہے تھے۔ انھوں نے فوراً ہمارا ہاتھ پکڑا اور کہا کہ کس درجہ کا ٹکٹ ہے؟ چلتی گاڑی میں چلنے کا حکم نہیں۔ میں نے خوشامدانہ لہجے میں کہا کہ گارڈ صاحب! خدا آپ کو ترقی دے کر میل کا بلکہ لاٹ صاحب کا اسپیشل گارڈ بنا دے۔ مجھے کسی طرح اس گاڑی میں بٹھلا دیجیے۔ اور نہیں تو کم سے کم پارسل ہی والے ڈبے میں اس کمترین کو رکھ دیجیے۔ گیا میں مجھے تول کر جو واجب محصول ہوگا لے لیجیے گا۔ مگر اس نے کوئی توجہ نہیں دی۔ ہنستا ہوا کھڑا دیکھتا رہا۔ اس ٹرین میں جانے والوں میں بعض جانے پہچانے صاحبوں نے کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا کہ کیا آپ چھوٹ گئے؟ میں نے نہایت متانت سے کہا کہ میں نہیں، ٹرین چھوٹ گئی۔ ایک صاحب گزرتے ہی گاڑی میں چلا کر بولے کہ آپ کب تک آیئے گا؟ کچھ کہنا ہے تو فرمایئے۔ آپ کے یہاں جا کر کہہ دوں گا۔ میں نے بلند آواز سے کہا کہ سب سے کہہ دیجیے گا کہ میں بخیر و عافیت اسٹیشن پہنچ گیا۔ آپ روانہ رہا تو انشاء اللہ عنقریب میں بھی پہنچتا ہوں۔ یہ گفتگو پوری ہونے بھی نہ پائی تھی کہ گارڈ صاحب کو آخری ڈبے پر چڑھنے کے لیے لپک کر جاتے دیکھا۔ میں نے چاہا کہ بڑھ کر ان کی ٹانگ کھینچ لوں اور کہوں کہ چلتی گاڑی میں چڑھنے کا حکم نہیں۔ مگر جب تک وہ پیردان پر پاؤں رکھ کر اپنے ڈبے میں داخل۔

میری نگاہوں کے سامنے پلیٹ فارم سے گزرتی ہوئی ٹرین، دماغ میں کرایہ کی لمثم، زبان پر یہ شعر تھا:

حسرت پہ اس مسافر بے کس کی رویئے
گاڑی کھلی ہو جس کی نگاہوں کے سامنے

□□□

دیوان حسرت عظیم آبادی

مرتبہ: ڈاکٹر اسا سعیدی

حسرت عظیم آبادی اپنے دور کے اہم شاعر تھے۔ ان کے کلام کا ایک انتخاب حسرت موہانی نے بھی شائع کیا تھا۔ یہ ان کا مکمل دیوان ہے جس پر فاضل مرتبہ نے اپنے مقدمے میں ان کی شاعرانہ خصوصیات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

صفحات: 484، قیمت -/100 روپے

دکن میں اردو

مصنف: نصیر الدین ہاشمی

یہ کتاب دکنیات کے سلسلے میں ایک اہم مقام رکھتی ہے اور متعدد یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ کتاب کے بعض بیانات سے بعد کے محققین نے جو اختلاف کیا ہے پیش لفظ میں مصنف کی جانب سے اس کی نشاندہی بھی کر دی گئی ہے۔

صفحات: 945، قیمت -/202 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-066 110

ڈپٹی نذیر احمد

ہماری مطبوعات سے

"توبۃ النصوح" سے ماخوذ

نصوح اور منجھلے بیٹے علیم کی گفتگو

نصوح نے نماز عصر سے فارغ ہو کر منجھلے بیٹے علیم کو پچھوایا کہ دیکھو مدرسے سے آئے یا نہیں۔ معلوم ہوا کہ ابھی آئے اور کپڑے اتار رہے ہیں تو کہلا بھیجا کہ اپنی ضرورتوں سے فارغ ہو کر ذرا میرے پاس ہو جائیں۔ تھوڑی دیر میں علیم مدرسے کا لباس اتار، کتابیں ٹھکانے سے رکھ باپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دیکھتے ہی باپ نے کہا! آؤ صاحب، آج کل تو میں نے سنا ہے تم کو بہت ہی محنت کرنی پڑتی ہے۔

بیٹا: امتحان ششماہی قریب ہے اسی کے واسطے کچھ تیاری کر رہا ہوں۔ دن تھوڑے سے رہ گئے اور کتابیں دیکھنے کو بہت باقی ہیں۔ ہر چند ارادہ کرتا ہوں کہ رات کو گھر پر کتاب دیکھا کروں مگر نہیں بن پڑتا۔ لوگ جو بھائی جان کے پاس آ کر بیٹھتے ہیں، ایسی اودھم مچاتے ہیں کہ طبیعت اچاٹ ہوئی چلی جاتی ہے۔

باپ: پھر تم کچھ اس کا انسداد نہیں کرتے؟

بیٹا: اس کا انسداد میرے اختیار سے خارج ہے اور رات رائیگاں جاتی ہے۔ دن کو البتہ میں نے مکان کا رہنا ہی چھوڑ دیا۔ صبح ہوئی اور اپنے کسی ہم جماعت کے یہاں چلا گیا۔

باپ: اور بڑے امتحان کے واسطے بھی تم کچھ تیاری کر رہے ہو؟

بیٹا: ابھی اس کے بہت دن پڑے ہیں۔ اس سے فارغ ہو کر دیکھا جائے گا۔

باپ: کیا اس کا کوئی وقت مقرر ہے؟

بیٹا: جناب ہاں! بڑے دن کی تعطیل کے قریب ہوا کرتا ہے۔

باپ: نہیں نہیں! تم نے میری مراد کو نہیں سمجھا۔ میں حساب آخر کو بڑا امتحان کہتا ہوں۔ کیا وہ بڑا امتحان نہیں ہے؟

علیم: کیوں نہیں؟ سچ پوچھیے تو سب سے بڑا سخت امتحان وہی ہے۔

باپ: تو جب میں تمہارے ان دنیاوی چھوٹے چھوٹے امتحانوں کی خبر رکھتا ہوں تو کیا اس بڑے سخت امتحان کی نسبت میں نے تم سے پوچھا تو کچھ بیجا کیا؟

بیٹا: جناب میں تو نہیں کہتا کہ آپ نے بیجا کیا۔ ایسا کہنا میرے نزدیک گستاخی اور گناہ دونوں ہے۔

باپ: اچھا تو میں سننا چاہتا ہوں کہ تم اس بڑے سخت امتحان کے واسطے کیا تیاری کر رہے ہو؟

بیٹا: جناب! سچ تو یہ ہے کہ میں نے اس امتحان کے واسطے مطلق تیاری نہیں کی۔

باپ: کیا یہ غفلت نہیں ہے؟

بیٹا: جناب! غفلت بھی پرلے درجے کی غفلت ہے۔

باپ: لیکن جب تم ایسے دانشمند ہو کہ دنیا کے چھوٹے چھوٹے امتحانوں کے لیے مہینوں اور برسوں پہلے سے تیاری کرتے ہو تو اس سخت امتحان سے غافل رہنا بڑے تعجب کی بات ہے۔

بیٹا: شامت نفس۔

باپ: لیکن تمہاری غفلت کا کچھ اور بھی سبب ضرور ہوگا؟

بیٹا: سبب یہی ہے میری سہل انگاری۔

باپ: تم جواب دیتے ہو لیکن صرف لفظوں کو پھیر پھار کر۔ میں تم سے غفلت کا سبب پوچھتا ہوں اور تم نے کہا کہ سہل انگاری اور سہل انگاری اور غفلت ایک چیز ہے تو گویا تم نے غفلت کو غفلت کا سبب کہا۔

بیٹا: شاید گھر میں دینداری کا چرچا نہ ہونے سے میری غفلت کو ترقی ہوئی ہو۔

باپ: بیشک یہی سبب ہے تمہاری غفلت کا اور میں نے تم سے کھود کھود کر اسی لیے دریافت کیا کہ جہاں تک تمہاری غفلت میری بے پروائی کی وجہ سے ہے، اس کا الزام مجھ پر ہے اور ضروری ہے کہ میں تمہارے روبرو اس کا اقرار کروں اور تم چھوٹے ہو کر مجھ کو ملامت کرو۔

بیٹا: نہیں جناب! قصور سراسر میرا ہے۔ مجھ کو خدا نے اتنی موٹی بات کے سمجھنے کی عقل دی تھی کہ مجھ کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے اور میرے پیدا کرنے سے صرف یہی غرض نہیں ہونی چاہیے کہ میں جانوروں کی طرح کھانے اور پانی سے اپنا پیٹ بھر کر سو رہا کروں۔

باپ: تمہاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہاری دینی معلومات بھی کم

"توبۃ النصوح" اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کا تیسرا ناول ہے جو پہلی بار 1877 میں شائع ہوا۔ اصلاح معاشرہ کے مقصد سے لکھے گئے اس ناول کو کلاسک کا درجہ حاصل ہے اور یہ ملک کی تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہے۔ ناول کا یہ ایڈیشن اتر پردیش اردو اکادمی کے 1983 میں شائع کردہ نسخے پر مبنی ہے۔کونسل کی شائع کردہ 175صفحات کی اس کتاب کی قیمت 75روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو 40فیصد رعایت بھی دیتی ہے۔

درجے کی نہیں ہے لیکن نہ تو دین کے مسائل میں نے تم کو خود سکھائے، نہ ان کے سیکھنے کی کبھی تاکید کی۔ مدرسے میں تاریخ و جغرافیہ و ہندسہ و ریاضی کے سوائے کوئی دوسری چیز پڑھاتے نہیں۔ پھر دینی معلومات حاصل کی تو کہاں سے کی؟

بیٹا: اس میں شک نہیں کہ میں نے چھوٹی سی عمر میں قرآن پڑھا تھا لیکن وہ دوسرے ملک کی زبان ہے۔ اول سے آخر تک پڑھ گیا، مطلق سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں کیا لکھا ہے اور کیا اس کا مطلب ہے؟ پھر مکتب میں گیا تو وہاں بھی کوئی دین کی کتاب پڑھنے کا اتفاق نہ ہوا۔ قصے کہانی ان میں بھی اکثر بری بری باتیں، یہاں تک کہ جن دنوں میں بہار دانش پڑھتا تھا، ایک پادری صاحب چاندنی چوک میں سر بازار وعظ کہا کرتے تھے۔ مکتب سے آتے ہوئے لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر میں بھی کھڑا ہو جاتا تھا۔ پادری صاحب کے ساتھ کتابوں کا بھی ایک بڑا بھاری ذخیرہ رہتا تھا اور اکثر لوگوں کو اس میں سے کتابیں دیا کرتے تھے۔ ہمارے مکتب کے کئی لڑکے بھی کتابیں لائے تھے۔ انھوں نے کتاب کی جلد تو اکھاڑ لی اور ورقوں کو یا تو پھاڑ کر پھینک دیا یا پٹھے بنائے۔ کتابوں کی عمدہ عمدہ جلدیں دیکھ کر مجھ کو بھی لالچ آیا اور میں نے کہا چلو ہم بھی پادری صاحب سے کتاب مانگیں۔ مکتب سے میں سیدھا پادری صاحب کے پاس چلا گیا۔ بہت سے لوگ ان کو گھیرے ہوئے تھے۔ ان میں ہمارے مکتب کے بھی دو چار لڑکے تھے۔ لوگ ان کے ساتھ کچھ مذہبی بحث کر رہے تھے۔ اس کو میں نے خوب نہیں سمجھا مگر ایک بات تھی کہ اکیلے پادری صاحب ایک طرف تھے اور ہندو مسلمان سیکڑوں آدمی ایک طرف۔ لوگ ان کو بہت سخت سخت باتیں بھی کہتے تھے۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ضرور لڑ پڑتا مگر پادری صاحب کی پیشانی پر چیں بھی تو نہیں آتی تھی۔ سخت بات سن کر الٹے مسکرا دیتے تھے۔ لڑکے ایک شیطان ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر تک تو کھڑے سنتے رہے۔ چلنے لگے تو ان میں سے ایک نے کہا! لولو ہے بے لولو ہے۔ اس کی یہ بات سب لوگوں کو ناگوار ہوئی اور دو چار آدمیوں نے اس کو مارنے کے لیے تھپڑ بھی اٹھائے۔ پادری نے روکا اور منع کیا کہ خبردار اس سے کچھ مت بولو! لولو موتی کو بھی کہتے ہیں۔ شاید اس نے یہ سمجھ کر کہا ہو تو اس کو انعام دینا چاہیے۔ پادری صاحب کی اس بات نے مجھ پر کیا شاید سب لوگوں کے دل پر بڑا ہی اثر کیا اور جب شام ہوئی، لوگ رخصت ہوئے تو کئی آدمی آپس میں کہتے جاتے تھے کہ بھائی اس شخص کا عقیدہ چاہے کیسا ہی ہو لیکن حلم اور بردباری یہ صفت تو اس میں اولیا اللہ کی سی ہے۔

غرض پادری صاحب کا سلسلۂ سخن منقطع ہو تو کتاب مانگوں لیکن نہیں معلوم پادری صاحب کو میرے قیافے سے یا کسی طرح پر معلوم ہو گیا کہ میں کچھ ان سے کہنا چاہتا ہوں۔ آپ ہی پوچھا کہ صاحبزادے تم کچھ مجھ سے کہو گے؟ میں نے کہا کہ آپ سب لوگوں کو کتابیں دیتے ہیں۔ ایک کتاب مجھ کو بھی دیجیے۔

پادری: بہت خوب۔ اس الماری میں سے تم ایک کتاب پسند کر لو۔

میں نے سنہری جلد کی ایک بڑی موٹی سی کتاب چھانٹی تو پادری صاحب نے کہا کہ مجھ کو اس کے دینے میں کچھ عذر نہیں لیکن تم اس کو پڑھ بھی سکو گے؟ کون سی کتاب تم پڑھتے ہو؟ میں نے کہا! بہار دانش۔

پادری: بھلا تمھارا آج کا سبق میں بھی سنوں۔

میں نے جزدان میں سے کتاب نکال پڑھنا شروع کیا۔ اس دن کا سبق کمبخت ایسا فحش اور بیہودہ تھا کہ لوگوں کے مجمع میں مجھ کو اس کا پڑھنا دشوار تھا۔ بمشکل کوئی دو تین سطریں میں نے پڑھی ہوں گی کہ پادری صاحب نے فرمایا بیشک تم نے جو کتاب پسند کی ہے اس کو بخوبی پڑھ سکو گے اور وہ کتاب میں تم کو خوشی سے دیتا ہوں۔ لیکن میں افسوس کرتا ہوں کہ کیوں میں نے تم کو ایسی کتاب کے پڑھنے کو کہا جس کے پڑھنے سے تم اور سننے سے میں اور یہ سب صاحب جو کھڑے ہوئے ہیں، خدا کے گناہگار ہوئے۔ خدا ہم سب کی خطا معاف کرے اور تم چاہے میری دوسری بات مانو یا نہ مانو لیکن اس کتاب کو تم ضرور چھوڑ دو کہ اس کا مطلب تمھارے مذہب کے بھی بالکل خلاف ہے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ایسے پڑھنے سے نہ پڑھنا تمھارے حق میں بہت بہتر ہے۔ یہ کتاب جو تم پڑھتے ہو تم کو گناہ اور برائی سکھاتی اور بداخلاقی اور بے حیائی کی خراب راہ دکھاتی ہے۔ باوجود یہ کہ لوگ پادری صاحب کی ہر بات کو کاٹتے تھے مگر اس کو سب نے تسلیم کیا۔

پادری صاحب سے جو کتاب میں مانگ کر لایا تھا اس کا نام تو مجھ کو معلوم نہیں مگر سلیس اردو میں کسی خدا پرست اور پارسا آدمی کے حالات تھے۔ اگر چہ فی الواقع میں اس کتاب کو جلد ہی کی لالچ سے لایا تھا لیکن میں نے کہا لاؤ دیکھوں تو چنانچہ میں نے اس کو دیکھنا شروع کیا۔ جوں جوں میں اس کو پڑھتا جاتا تھا، میرا دل اس میں لگتا تھا اور اس کی باتیں مجھ کو بھلی معلوم ہوتی جاتی تھیں۔ اس کتاب کے پڑھنے سے مجھ کو معلوم ہوا کہ میرا طرز زندگی جانوروں سے بھی بدتر ہے اور میں روئے زمین پر بدترین مخلوقات ہوں۔ اکثر اوقات مجھ کو اپنی حالت پر رونا آتا تھا اور گھر والوں کا وطیرہ دیکھ کر مجھ کو ایک وحشت ہوتی تھی۔ یا تو میری یہ کیفیت تھی کہ مصیبت مند لوگوں کو

دیکھ کر ہنسا کرتا تھا یا اس کتاب کی برکت سے دوسروں کی تکلیف کو میں اپنی تکلیف سمجھنے لگا۔ مکتب اور بہارِ دانش دونوں کو تو میں نے اسی دن سلام کیا تھا جس روز کہ پادری صاحب نے مجھ کو نصیحت کی، گھر میں اکیلا پڑا ہوا دن بھر اسی کتاب کو دیکھا کرتا۔ مکتب کے لڑکے چند بار مجھ کو بلانے آئے مگر میں نہ گیا۔ آخر خود میاں صاحب تشریف لائے اور میں نے جی کو مضبوط کر ان سے صاف کہہ دیا کہ مجھ کو پڑھنا منظور نہیں۔ آپ ان دنوں دکھن میں تشریف رکھتے تھے۔ ایک روز نصیبوں کی شامت میں نہیں معلوم کہاں چلا گیا؟ میری غیبت میں وہ کتاب کہیں بھائی جان کی نظر پڑ گئی اور شب برات کے کوئی چار پانچ دن باقی تھے۔ بھائی جان کو پٹاخوں کے واسطے ردّی درکار تھی، بے تامل کتاب کو چیر پھاڑ برابر کر دیا۔ میں نے آکر دیکھا، بہتیرا سر پٹکا، کیا ہوتا تھا۔ دوڑا ہوا چوک گیا کہ پادری صاحب ہوں تو دوسرا نسخہ لاؤں مگر معلوم ہوا کہ صاحب آگرہ چلے گئے ہیں۔ کفِ افسوس مل کر رہ گیا۔ بھائی صاحب کے دوستوں سے شکایت کی تو انھوں نے کہا میاں شکر کرو کہ وہ کتاب پھٹ گئی نہیں تو تم کرشٹان ہی ہو گئے ہوتے۔ جواب سن کر تو مجھ کو ایک نئی حیرت پیدا ہوئی کہ اگر کرشٹان ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جن کا حال میں نے اس کتاب میں پڑھا تو ان کو برا سمجھنا کیا معنی؟ خیر، چندے یہ خیالات رہے۔ اس کے بعد میں مدرسے میں داخل ہوا اور دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔ اگر آپ کے نزدیک میرے خیالات دین و مذہب سے کچھ علاقہ رکھتے ہیں تو یہ صرف اس کتاب کا اثر ہے، ورنہ دین کا کوئی رسالہ بھی مجھ کو دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

اہلِ اسلام اور عیسائیوں کے معتقدات میں کچھ اختلاف ہے مگر پھر بھی جس قدر کہ عیسائیوں کا مذہب اسلام سے ملتا ہوا ہے۔ اتنا کوئی دوسرا مذہب نہیں ملتا۔ قرآن میں کئی جگہ عیسائیوں اور ان کے بزرگانِ دین قسیسوں اور راہبوں کی تعریف آئی ہے۔ عیسائیوں کی نرم دلی اور خاکساری کی مدح کی ہے، ان کی انجیل کلامِ الٰہی ہے۔ عیسائیوں کے ساتھ مواکلت درست، مناکحت روا۔ غرض مغائرت کہ اہلِ اسلام عیسائیوں کے ساتھ برتتے ہیں ایک امرِ نامشروع ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ ہمارے مذہب کی عمدہ کتابیں تمھارے دل پر پادری صاحب کی کتاب سے بہتر اثر کرتیں۔ خصوصاً جو ضرورت کہ مجھ کو درپیش ہے مجھ کو یقین ہے کہ تمھارا اس کتاب کو دیکھ لینا اس میں بہت کام آئے گا۔ ہمدردی کی جیسی کچھ تاکید ہے تم نے اس کتاب میں دیکھا ہوگا۔

بیٹا: اگر وہ مذہبی کتاب تھی تو میں جانتا ہوں کہ خاکساری و ہمدردی شرط عیسائیت ہے۔

باپ: شرط عیسائیت بلکہ شرط انسانیت ہے:

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرو بیاں

لیکن میں تم سے سننا چاہتا ہوں کہ تم اس فرض کی تعمیل کہاں تک کرتے ہو؟

بیٹا: جناب! اگر میں اس کو ہمدردی کہہ سکوں تو مدرسے کا جو لڑکا مجھ سے کچھ پوچھنا یا پڑھنا چاہتا ہے میں اس میں مطلق دریغ نہیں کرتا گو میرا ذاتی حرج بھی ہوتا ہو۔ امتحان سالانہ میں مجھ کو نقد روپے ملے تھے میں نے ایک پیسہ اپنے اوپر خرچ نہیں کیا۔ محلے میں چند آدمی رہتے ہیں جن کو میں محتاج سمجھتا ہوں۔ وقتاً فوقتاً ان کو اس میں سے دیتا رہا بلکہ ایک مرتبہ میں ایک دقت میں بھی مبتلا ہو گیا تھا۔

باپ: وہ کیا؟

بیٹا: ایک مرتبہ عید کو ایک بڑی بھاری ٹوپی مجھ کو اماں جان نے بنا دی تھی۔ وہی ٹوپی اوڑھے ہوئے میں خالہ جان کے یہاں جاتا تھا۔ میاں مسکین کے کوچے میں پہنچا تو بہت سے چپراسی پیادے ایک گھر کو گھیرے ہوئے تھے اور بہت سے تماشائی بھی وہاں جمع تھے۔ یہ دیکھ کر میں بھی لوگوں میں جا گھسا تو معلوم ہوا کہ ایک غریب نہایت غریب بوڑھی سی عورت ہے اور چھوٹے چھوٹے کئی بچے ہیں۔ سرکاری پیادے اس کے میاں کو پکڑے لیے جاتے تھے۔ اس واسطے کہ اس نے کسی بنیے کے یہاں سے ادھار کھایا تھا اور بنیے نے اس پر ڈگری جاری کرائی تھی۔ وہ مرد مانتا تھا کہ قرضہ واجب ہے مگر کہتا تھا کہ میں کیا کروں؟ اس وقت بالکل تہی دست ہوں۔ ہر چند اس بیچارے نے بنیے کی اور سرکاری پیادوں کی بہتیری ہی خوشامد کی مگر نہ بنیا مانتا تھا، نہ پیادے باز آتے تھے اور پکڑے لیے چلے جاتے تھے۔ لوگ جو وہاں کھڑے تھے انھوں نے بھی کہا! لالہ جہاں تم نے اتنے دنوں صبر کیا، دس پانچ روز اور صبر کر جاؤ تو بنیا بولا "اچھی کہی! میاں جی اچھی کہی! برسوں کا کہنا اور روز کی ٹال مٹول، بھگوان جانے ابھی تو کہان صاحب کی اجنت اتروائے لیتا ہوں۔"
وہ شخص جس پر ڈگری جاری تھی غریب تو تھا لیکن غیرت مند بھی تھا۔ بنیے نے جو عزت اتروانے کا نام لیا سرخ ہو گیا اور گھر میں گھس تلوار میان سے نکالا چاہتا تھا کہ بنیے کا سر الگ کر دے کہ اس کی بیوی اس کے پیروں میں لپٹ گئی اور رو کر کہنے لگی، خدا کے لیے کیا غضب کرتے ہو؟ یہی تمھارا غصہ ہے تو پہلے مجھ پر اور بچوں پر ہاتھ صاف کرو کیوں کہ تمھارے بعد ہمارا تو کہیں بھی ٹھکانا نہیں۔ ماں کو روتا

دیکھ بچے اس طرح ڈاڑھ مار کر روئے کہ میرا دل ہل گیا اور دوڑ کر سب کے سب باپ کو لپٹ گئے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر خاں صاحب بھی ٹھنڈے ہوئے اور تلوار کو میان کر کھونٹی سے لٹکا دیا اور بی بی سے کہا! اچھا تو نیک بخت پھر مجھ کو اس بے غیرتی سے بچنے کی کوئی تدبیر بتا۔ بی بی نے کہا! بلا سے جو چیز گھر میں ہے اس کو دے کر کسی طرح اپنا پنڈ چھڑاؤ۔ تم کسی طرح رہ جاؤ تو پھر جیسی ہوگی دیکھی جائے گی، توا، چکی، پانی پینے کا کٹورا، نہیں معلوم کن وقتوں کی ہلکی ہلکی بے قلعی دو پتیلیاں، بس یہی اس گھر کی کل کائنات تھی۔ چاندی کی دو دو چوڑیاں لیکن ایسی پتلی جیسے تار، اس نیک بخت عورت کے ہاتھوں میں تھیں۔ یہ سب سامان خاں صاحب نے باہر لاکر اس بنیے کے روبرو رکھ دیا۔ اول تو بنیا ان چیزوں کو ہاتھ ہی نہیں لگاتا تھا۔ لوگوں نے بہت کچھ کہا سنا یہاں تک کہ ان سرکاری پیادوں کو بھی رحم آیا۔ انھوں نے بھی بنیے کو سمجھایا۔ بارے خدا خدا کر کے وہ اس بات پر رضامند ہوا کہ پانچ روپیہ اصل اور دو روپے سود، ساتوں کے ساتوں دے دیں تو فارغ خطی لکھ دے۔ لیکن خاں صاحب کا کل اثاثہ چار ساڑھے چار سے زیادہ کا نہ تھا۔ تب پھر گھر میں گئے اور بی بی سے کہا کہ ڈھائی روپے کی کسر رہ گئی ہے۔ تو بی بی نے کہا اب تو کوئی چیز بھی میرے پاس نہیں، ہاں لڑکی کے کانوں میں چاندی کی بالیاں ہیں، دیکھو جوان کو ملا کر پوری پڑے۔ وہ لڑکی کوئی چھ برس کی تھی بس بعینہٖ جتنی ہماری حمیدہ، ماں جو لگی اس کی بالیاں اتارنے تو وہ لڑکی اس حسرت کے ساتھ روئی کہ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے دل میں کہا کہ الٰہی اس وقت مجھ سے کچھ بھی اس کی مدد نہیں ہو سکتی۔ فوراً دل میں آیا کہ ایک روپیہ اور کوئی دو آنے کے پیسے تو نقد میرے پاس ہیں۔ دیکھوں ٹوپی بک جائے تو شاید خاں صاحب کا سارا قرضہ چک جائے۔ بازار تو قریب تھا ہی فوراً میں گلی کے باہر نکل آیا۔ رومال تو سر سے لپیٹ لیا اور ٹوپی ہاتھ میں لے ایک گوٹے والے کو دکھائی۔ اس نے چھ کی آنکی میں نے بھی چھوٹتے ہی کہا لا بلا سے چھ ہی دے۔

غرض چھ وہ اور ایک میرے پاس نقد تھا ہی ساتوں روپے لے میں نے چپکے سے اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ تب تک پیادے خاں صاحب کو گرفتار کر کے لے جا چکے تھے اور گھر میں رونا پیٹنا مچ رہا تھا۔ دفعتاً پورے سات روپے ہاتھ میں دیکھ اس عورت پر ایک شادیِ مرگ کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور اس خوشی میں اس نے کچھ نہیں سوچا کہ یہ روپیہ کیسا ہے اور کس نے دیا ہے؟ فوراً اپنے ہمسایے کو روپے دے کر دوڑایا اور خود بچوں سمیت دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔ بات کی بات میں خان صاحب چھوٹ آئے تو بچوں کو کیسی خوشی کہ کودیں اور اچھلیں، کبھی باپ کے کندھے پر اور کبھی ماں کی گود میں اور کبھی ایک پر ایک۔ اب اس عورت کو میرا خیال آیا اور بچوں سے بولی کہ کمبختو! کیا اودھم مچاتے ہو (اور میری طرف اشارہ کر کے کہا) دعا دو اس اللہ کے بندے کی جان و مال کو جس نے آج باپ کی اور تم سب کی جانیں رکھ لیں۔ نہیں ٹکڑا بھی مانگا نہ ملتا کوئی چچا یا ماموں بیٹھا تھا کہ اس کو تمھارا درد ہوتا اور اس مصیبت کے وقت تمھاری دست گیری کرتا۔ صرف ایک باپ کے دم کا سہارا کہ اللہ رکھے اس کے ہاتھ پاؤں چلتے ہیں تو محنت سے مزدوری سے خدا کا شکر ہے روکھی سوکھی روز کے روز دو وقت نہیں تو ایک ہی وقت مل تو جاتی ہے۔ ہمارے حق میں تو یہ لڑکا کیا ہے؟ رحمت کا فرشتہ ہے۔ نہ جان نہ پہچان، نہ رشتہ نہ ناتا اور اس اللہ کے بندے نے بھر مٹھی روپے دے کر آج ہم سب کو نئے سرے سے زندہ کیا۔ وہ بچے جس شکر گزاری کی نظر سے مجھ کو دیکھتے تھے، اس کی مسرت اب تک میں اپنے دل میں پاتا ہوں۔ روپیہ خرچ کرنے کے بعد مجھ کو عمر بھر ایسی خوشی نہیں ہوئی جیسی کہ اس دن تھی مگر دونوں میاں بی بی کے ذہن میں اس وقت تک یہ بات نہیں آئی تھی کہ میں نے روپیہ ان کو دے دیا وہ سمجھے تھے کہ قرض کے طور پر دیا ہے۔ وہ عورت مجھ کو اپنے گھر میں لے گئی اور ٹوٹی سی ایک چوکی پڑی تھی میں ہر چند منع کرتا رہا، جلدی سے اس کو اپنے دوپٹے سے جھاڑ مجھ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میاں سے بولی نوج کوئی تم جیسا بے خبر ہو، کھڑے کیا ہو، جاؤ ایک گلوری بازار سے میاں کے لیے لگوا لاؤ۔

میں: نہیں میں پان نہیں کھاتا، تکلیف مت کرو۔

عورت: بیٹا! تمھاری خدمت میں اور ہم کو تکلیف، جی چاہتا ہے کہ آنکھیں تمھارے تلوؤں میں بچھا دوں، قربان اس پیاری پیاری صورت کے، نثار اس بھولی بھولی شکل کے، بیٹا تم یہ تو بتاؤ کہ تم ہو کون؟

میں: میری خالہ میاں صابر بخش کی سرائے میں رہتی ہیں۔

عورت: پھر بیٹا یہ اپنا روپیہ تم ہم سے کب لوگے؟ ہم اپنا اور بچوں کا پیٹ کاٹیں گے اور تمھارا قرضہ سب سے پہلے ادا کریں گے مگر کام ان دنوں مندا ہے۔ دیں گے تو ہم جس طرح بن پڑے گا دو ہی مہینے میں، مگر جہاں اتنی مہربانی کی ہے اتنا سلوک اور کرو کہ دو روپے مہینہ لے لیا کرو۔

میں: آپ روپے کے ادا کرنے کی کچھ فکر نہ کیجئے۔ میں نے لینے کی نیت سے نہیں دیا۔ یہ سن کر تمام خاندان کا خاندان اتنا خوش ہوا کہ میں بیان نہیں کر سکتا اور میں ان میں اس وقعت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا

جیسے خوش دل اور شکر گزار رعایا میں کوئی بادشاہ یا حلقۂ مرید ان ارادت مند میں کوئی پیر و مرشد۔ اس عورت کے منہ سے مارے خوشی اور شکر گزاری کے بات نہیں نکلتی تھی۔ بار بار میری بلائیں لیتی تھی اور میرے ہاتھوں کو چومتی اور آنکھوں کو لگاتی تھی۔ اسی کی بلاؤں میں رومال سر پر سے کھسک گیا تو اس نے دیکھا کہ میرے سر پر ٹوپی نہیں۔ پوچھا تو مجھ کو کہنا پڑا کہ وہی ٹوپی بیچ کر میں نے روپیہ دیا۔ پھر تو اس کا یہ حال تھا کہ بچھی جاتی تھی۔ سات روپیہ کی بھی کچھ حقیقت تھی مگر اس نے مجھ کو سیکڑوں ہزاروں ہی دعائیں دی ہوں گی۔ اس نے جو اتنی احسان مندی ظاہر کی تو میں الٹا اسی کا ممنون ہوا، جس قدر خوشامد کرتی تھی میں شرمندہ ہوتا تھا اور جتنا وہ عاجزی سے پیش آتی تھی میں زمین میں گڑا جاتا تھا۔

غرض میں وہاں سے رخصت ہوا تو ٹوپی نہ ہونے کی وجہ سے سیدھا گھر لوٹ آیا۔ عین گلی میں بھائی جان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے میری ہیئت کذائی دیکھ کر تعجب کیا اور پوچھا کہ ایں! کیا ٹوپی کے بدلے چنے لے کھائے۔ میں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اس واسطے کہ مجھ کو اس بات کا ظاہر کرنا منظور نہ تھا۔ شام کو بھائی جان سے اور اما جان سے تکرار ہوئی۔ بھائی جان کچھ روپے مانگتے تھے اور اما جان کہتی تھی بیٹا! ان فضول خرچیوں سے گھر کے دن چلے گا۔ لو پرسوں میں نے تم کو چار روپے دیئے۔ تم نے چاروں کے چاروں برابر کیے، ناخن بھر چیز تم گھر میں لائے ہو تو بتا دو، اتنا چٹورپن، ایسا اسراف۔

بھائی جان نے کہا! میں چٹورا نہیں ہوں، چٹورے تمھارے بھلے صاحبزادے ہیں، جن کو تم بڑا مولوی سمجھتی ہو کہ سر کی ٹوپی تک بیچ کر کھا گئے۔ اماں جان نے مجھ کو بلا کر پوچھا، میں نے کہا! اگر بیچ کر کھا جانا ثابت ہو جائے تو جو چور کی سزا وہ میری سزا۔

اماں جان: پھر کیا کہیں کھو دی؟

میں: کھوئی بھی نہیں۔

اماں جان: بھائی تو تو عجب تماشے کا لڑکا ہے۔ بیچی نہیں، کھوئی نہیں پھر ٹوپی گئی تو کہاں گئی؟

میں: اگر یہی تمھارے لچھن ہیں تو تم نے پڑھ لکھ کر ڈبویا۔

میں: اس وقت عجب مشکل میں مبتلا تھا، ظاہر کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا اور بے ظاہر کیے بن نہیں پڑتی تھی۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔

مگر مجھ کو یقین تھا کہ جب میرا معاملہ پاک صاف ہے تو گویا بالفعل بھائی جان کے کہنے اور میرے چپ رہنے سے اماں جان کو ایک بدگمانی سی ہوگئی ہے لیکن کبھی نہ کبھی ضرور ان کے دل سے خدشہ دفع ہو ہی جائے گا اور کچھ نہ ہوگا تو میرے اگلے پچھلے فعلوں کو دیکھ کر اتنا تو جی میں سمجھ لیں گی کہ بیٹا بدراہ نہیں ہے، نہیں معلوم ٹوپی کا کیا بھید ہے؟ سو خدا کی قدرت ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ صالحہ بیمار پڑی تو اماں جان اس کی عیادت کو گئیں۔ میں ان کے ساتھ تھا۔ ابھی اماں جان سواری سے نہیں اتری تھیں کہ ادھر سے وہی خاں صاحب چلے آرہے تھے۔ مجھ کو دیکھ کر دور ہی سے دعائیں دینے لگے اور ایسے تپاک اور دلسوزی کے ساتھ میری خیر و عافیت پوچھی کہ جیسے کوئی اپنا بزرگ اور اپنا عزیز دریافت حال کرتا ہے۔ خیر میں نے مناسب حالت جواب دیا۔ اماں جان آخر یہ سب باتیں پردے کے اندر بیٹھی ہوئی سن رہی تھیں۔ اترتے کے ساتھ ہی مجھ سے پوچھا! علیم یہ کون شخص تھا جو تم سے باتیں کرتا تھا؟

میں: یہ ایک خاں صاحب ہیں اور میاں سکین کے کوچے میں رہتے ہیں۔ بس میں اس قدر جانتا ہوں۔

اماں جان: لیکن باتیں تو تم سے ایسے گرویدہ ہو ہو کر کرتے تھے کہ گویا برسوں کی جان پہچان ہے۔

میں: نہیں شاید ان کو میرا نام بھی معلوم نہیں۔

اماں جان: پھر تمھارے ساتھ ایسے خلوص سے کیوں پیش آئے۔

میں: بعض لوگوں کا دستور ہوتا ہے کہ ذرا سے تعارف میں بھی بڑے تپاک کے ساتھ پیش آیا کرتے ہیں۔ اگرچہ میرے جواب سے اماں جان کی تشفی نہیں ہوئی مگر ان کو اندر جانے کی جلدی تھی چلی گئیں۔ خاں صاحب نے اپنے گھر میں میرا تذکرہ کیا۔ میں تو گھر چلا آیا مگر غالب ہے کہ ان کی بیوی اماں جان کے پاس گئیں اور میرے اس ٹوپی بیچنے اور روپیہ دینے کا تمام ماجرا بیان کیا۔ پھر جو اماں جان آئیں تو مجھ سے کہنے لگیں علیم ہم نے تمھاری چوری آخر پکڑی۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ میری چوری؟

اماں جان: جی، ہاں چوری۔

میں: بھلا میں بھی سنوں۔

اماں جان: کیوں تم پہلے ٹوپی کا حال بتا لو تب مجھ سے اپنی چوری کی حقیقت سنو۔ اتنا کہنے سے میں سمجھ گیا اور ہنس کر چپ ہو رہا۔

□□□

ہماری مطبوعات سے — ''خطبات آزادی'' سے ماخوذ

نیتاجی سبھاش چندر بوس کا خطبۂ صدارت

تری پوری—مارچ 1939

ڈیلی گیٹ بہنو اور بھائیو! آپ نے دوسری مرتبہ مجھے انڈین نیشنل کانگریس کا صدر کر کے اور یہاں تری پوری میں پرتپاک خیر مقدم کر کے جو عزت بخشی ہے اس کے لیے آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ درست ہے کہ آپ نے میری درخواست پر دھوم دھام کا پروگرام ترک کر دیا ہے جو عموماً ایسے موقعوں پر رکھا جاتا ہے۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اس سے اس گرم جوشی اور تپاک میں ذرہ بھر فرق نہیں پڑا جس سے آپ نے میرا سواگت کیا ہے۔

دوستو! پیشتر اس کے کہ میں اپنا ایڈریس پڑھوں۔ میں اس امر پر مسرت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ مہاتما گاندھی جس مشن کو لے کر راجکوٹ گئے تھے وہ پورا ہو گیا ہے۔ اور نتیجتاً انھوں نے برت کھول دیا ہے۔ اب سارے ملک نے اطمینان کا سانس لیا ہے اور خوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔

دوستو! یہ سال کئی پہلوؤں سے غیر معمولی ثابت ہوگا اس بار صدارتی انتخاب ادنیٰ قسم کا نہیں تھا۔ انتخاب کے بعد سنسنی خیز واقعات رونما ہوئے۔ ورکنگ کمیٹی کے پندرہ ممبروں میں سے بارہ سردار پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کی رہنمائی میں مستعفی ہو گئے۔ ورکنگ کمیٹی کے ایک اور سرکردہ ممبر پنڈت جواہر لال نہرو نے گو باضابطہ طور پر استعفیٰ نہ دیا تاہم ان کے بیان سے ہر ایک نے یہی سمجھا کہ وہ بھی مستعفی ہو گئے ہیں۔ تری پوری کانگریس کے عین قبل راجکوٹ کے واقعات کے مدنظر مہاتما گاندھی کو مرن برت رکھنا پڑا۔ میں بیماری کی حالت میں یہاں پہنچا ہوں۔ اس لیے چاہتا ہوں کہ اس سال صدارتی ایڈریس لمبا نہ ہو۔

دوستو! آپ کو معلوم ہوا ہے کہ مصر کے ''ڈیلی گیٹ'' انڈین نیشنل کانگریس کے دوستوں کی حیثیت سے یہاں تشریف لائے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ میرے ساتھ ان سب کا دلی خیر مقدم کریں گے۔ ہم انتہائی خوش ہیں کہ انھوں نے ہماری دعوت کو قبول کیا اور سفر کر کے یہاں پہنچے۔ ہمیں افسوس ہے کہ مصر کی سیاسی پیچیدگیوں کے مدنظر وفد پارٹی کے لیڈر مصطفیٰ نحاس پاشا ذاتی طور پر ڈیلی گیشن کی رہنمائی نہ کر سکے۔ میں وفد پارٹی کے پریذیڈنٹ اور سرکردہ ممبروں کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ اس لیے ان میں بہتوں کو یہاں پاکر انتہائی خوش ہوا۔ ایک بار پھر اپنے ہم وطنوں کی طرف سے میں ان کا گرم جوشی اور تپاک سے خیر مقدم کرتا ہوں۔

تری پوری کانگریس کے بعد جو فروری 1938 میں منعقد ہوئی تھی۔ جس قدر اہم بین الاقوامی واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم معاہدہ میونک ہے جو ستمبر 1938 میں ہوا۔ اس میں فرانس اور برطانیہ نے نازی جرمن کے آگے بہت بری طرح ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ نتیجتاً فرانس یورپ میں ایک غالب طاقت کے طور پر ختم ہو گیا اور ایک فائر بغیر یورپ کی لیڈر شپ جرمنی کو حاصل ہو گئی۔ حال ہی میں سپین کی ری پبلکن گورنمنٹ کے خاتمہ سے بھی فاشسٹ اٹلی اور نازی جرمنی کی طاقت اور وقار میں اضافہ ہوا ہے۔ نام نہاد جمہوری طاقتیں فرانس اور برطانیہ سوویٹ روس کو سردست یورپین سیاسیات سے خارج کرنے کے لیے اٹلی اور جرمنی سے مل گئی ہیں۔ لیکن یہ حالت کب تک جاری رہے گی اور روس کو ذلیل کر کے فرانس اور برطانیہ نے کیا حاصل کیا ہے؟

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حال ہی میں یورپ اور ایشیا میں جو بین الاقوامی واقعات رونما ہوئے ہیں ان کی وجہ سے برطانوی اور فرانسیسی امپیریلزم کی طاقت اور وقار کو بھاری دھکا لگا ہے۔

اپنی خرابیٔ صحت کی وجہ سے میں صرف چند اہم مسائل کا ذکر کروں گا کہ عرصے سے میں جو کچھ محسوس کرتا رہا ہوں اس کا واضح الفاظ میں اظہار کرنا چاہتا ہوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ سوراج کے سوال کو اٹھایا جائے اور اپنا قومی مطالبہ الٹی میٹم کی صورت میں برطانوی گورنمنٹ کے سامنے پیش کیا جائے۔ اب وقت نہیں رہا کہ ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔ ہمارے

1921سے1946 کے درمیان کانگریس کے 17اہم جلسے ہوئے جن کی صدارت حکیم اجمل خاں سی. آر. داس، محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مہاتما گاندھی، سروجنی نائیڈو، مختار احمد انصاری، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس جیسے قومی رہنماؤں نے کی۔ اس کتاب میں آزادی سے قبل کانگریس کے جلسوں میں پیش کیے گئے تمام صدارتی خطبے جمع کر دیے گئے ہیں۔ 580 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 280 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ اور اساتذہ کو 40 فیصد رعایت بھی دیتی ہے۔

سامنے مسئلہ یہ نہیں کہ فیڈریشن اسکیم ہم پر کب ٹھونسی جائے گی۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر چند سال تک جب تک کہ یورپ میں امن قائم نہ ہو جائے۔ فیڈرل اسکیم کو معرض التوا میں ڈال دیا جائے تو ہمیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یورپ میں چار طاقتوں کے معاہدے کی بدولت یا کسی اور طریقے سے پائدار امن قائم ہو گیا تو سلطنت کے متعلق برطانیہ کی پالیسی سخت ہو جائے گی۔

اس وقت وہ یہودیوں کے خلاف عربوں کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ کیوں کہ بین الاقوامی سیاسیات میں کمزوری کا احساس کرتا ہے۔ اس لیے میری رائے یہ ہے کہ ہمیں اپنا قومی مطالبہ الٹی میٹم کی صورت میں برطانوی گورنمنٹ کو پیش کرنا چاہیے اور اسے پورا کرانے کے لیے کچھ مہلت دینی چاہیے۔ اس کے اندر اندر جواب کی توقع رکھی جائے لیکن اگر اس عرصہ میں کوئی جواب نہ ملے یا جواب تسلی بخش نہ ہو تو ہمیں قومی مطالبہ منوانے کے لیے وہ تمام تدابیر کرنی چاہئیں جو ہم اختیار کر سکتے ہوں۔

ہمارے پاس جو طریقہ کار ہے وہ سول نافرمانی یا ستیہ گرہ ہے اور آج برطانوی گورنمنٹ طویل عرصے تک آل انڈیا ستیہ گرہ جیسی بڑی تحریک کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ جان کر مجھے دکھ ہوتا ہے کہ بعض کانگریسی مایوس ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ابھی برطانوی امپیریلزم پر بھاری حملہ کرنے کا وقت نہیں آیا۔ لیکن اگر حقائق کی روشنی میں صورت حال کو دیکھا جائے تو ایسی مایوسی کے لیے ذرا بھی گنجائش نہیں۔ اس وقت جب کہ آٹھ صوبوں میں کانگریس برسر اقتدار آ گئی ہے ہماری طاقت اور وقار بڑھ گیا ہے۔ برطانوی ہند کے طول و عرض میں اجتماعی تحریک بہت زور پکڑ چکی ہے۔ اور یہ بھی کم اہم بات نہیں کہ دیسی ریاستوں میں بھی غیر متوقع بیداری آ گئی ہے۔ اس لیے سوراج کی طرف فیصلہ کن قدم اٹھانے کے لیے ہماری قومی تاریخ میں اس سے زیادہ بہتر موقع کون سا ہو سکتا ہے۔ بالخصوص اس وقت جب کہ بین الاقوامی صورت حال ہمارے لیے سازگار ہے۔ میں ایک پکا آشاوادی ہوں اور موجودہ حالات ہمارے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں اس لیے ہمارے حوصلے انتہائی بلند ہونے چاہئیں۔ اگر ہم اپنے اختلافات دور کر دیں اور تمام طاقت کو قومی تحریک پر لگائیں تو برطانوی امپیریلزم پر کاری چوٹ لگا سکتے ہیں۔ کیا ہم سیاسی تدبر سے کام لے کر اپنی پوزیشن کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں گے؟ یا اس موقع کو کھو دیں گے جو ملک کی زندگی میں شاذ و نادر ہی آتا ہے:

میں ہندوستان اور دیسی ریاستوں کی بیداری کا پہلے بھی ذکر کر چکا ہوں۔ میری یہ قطعی رائے ہے کہ ہم نے ریاستوں کے متعلق ہری پورہ کانگریس کے ریزولیشن پر یہ پابندی لگائی ہے کہ کانگریس کے نام پر ریاستوں کے اندر بعض قسم کی تحریکیں نہ چلائی جائیں۔ اس ریزولیشن کی رو سے کانگریس کے نام پر نہ تو کوئی پارلیمینٹری کام کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ریاستوں کے موجودہ نظام کے خلاف جدوجہد کی جا سکتی ہے۔ لیکن ہری پورہ کانگریس کے بعد کئی واقعات ہو چکے ہیں۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ بعض ریاستوں کے حکام پیراماؤنٹ پاور کے مشورے کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔ ان حالات میں کیا ہم کانگریسیوں کو ریاستی باشندوں کے زیادہ قریب نہیں ہونا چاہیے۔

مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ آج ہمارا فرض کیا ہے۔ نہ صرف متذکرہ بالا پابندی کو اٹھا دینا چاہیے بلکہ ورکنگ کمیٹی کو ریاستوں میں شہری آزادی اور ذمہ دار گورنمنٹ کی تحریک عامہ کی رہنمائی کرنے کے لیے کام کو باقاعدہ طور پر کرنا چاہیے۔ اب تک جو کچھ کام ہوا ہے وہ وقتاً فوقتاً اور تھوڑا تھوڑا ہوا ہے۔ بالکل باقاعدہ طور پر اس سلسلہ میں کوئی قطعی اسکیم مرتب نہیں کی گئی۔ لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ ورکنگ کمیٹی یہ ذمہ داری اٹھائے اور اسے باقاعدہ طور پر سرانجام دے اور اگر ضرورت محسوس کی جائے تو اس مقصد کے لیے سب کمیٹی مقرر کی جانی چاہیے۔ مہاتما گاندھی کے دلیرانہ مشورے اور تعاون کے ساتھ ساتھ آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانفرنس کے مشوروں کا پورا فائدہ اٹھایا جانا چاہیے۔

ہمیں سوراج کی طرف فیصلہ کن پیش قدمی کرنی چاہیے۔ اس کے لیے کافی تیاری کی ضرورت ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں بے دردی سے ان خرابیوں اور کمزوریوں کو دور کرنا چاہیے جو عہدوں کے لالچ کی وجہ سے کانگریس میں آ گئی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمیں ملک کی تمام انٹی امپیریلسٹ جماعتوں اور بالخصوص کسان تحریک اور ٹریڈ یونین تحریکات کا قریبی تعاون حاصل کرنا چاہیے۔ ملک کے تمام انتہا پسند عناصر اور تمام انٹی امپیریلسٹ جماعتوں کی کوششیں یہ ہونی چاہیے کہ امپیریلزم پر حملہ کیا جائے۔

دوستو! آج کانگریس کے اندر فضا مکدر ہے اور اختلافات رونما ہو گئے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر ہمارے کئی دوست بددل اور بے حوصلہ ہو گئے ہیں۔ لیکن میں پکا آشاوادی ہوں۔ جو بادل آپ آج دیکھ رہے ہیں وہ گزر جائیں گے۔ مجھے اپنے ہم وطنوں کی دیس بھگتی پر اعتماد ہے اور مجھے یقین ہے کہ بہت جلد ہم اپنی موجودہ مشکلات پر قابو پالیں گے اور متحد ہو جائیں گے۔ 1922 میں گیا کانگریس کے وقت بھی اسی قسم کی صورت حال پیدا ہو گئی تھی جب کہ سورگیہ دیش بندھو داس اور پنڈت موتی لال نہرو نے سوراج پارٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ میری یہ پرارتھنا ہے کہ میرے پوجیہ سورگیہ گورو اور پوجیہ موتی لال جی اور ہندوستان کے دیگر سپوتوں کی آتمائیں موجودہ الجھن میں ہمیں فعال کریں اور مہاتما گاندھی جی جو ہماری قوم کو ہدایت اور مدد دینے کے لیے اب بھی ہمارے ساتھ ہیں کانگریس کو موجودہ الجھن سے نکالنے میں تعاون کریں۔

□□□

تحریر: راکیش کمار جھا
ترجمہ: رئیس احمد

ویٹرنری سائنس میں کیریئر

بے زبانوں کی بیماریوں اور پریشانیوں کو دور کرنا کسی بڑی چنوتی سے کم نہیں۔ اگر آپ کو سائنس سے دلچسپی اور جانوروں سے محبت ہے تو آپ ایک بہتر مویشی ڈاکٹر بن کر اپنے کیریئر کو ایک خاص سمت عطا کر سکتے ہیں۔

مویشیوں کو پالنے کا عمل کسانوں کی آمدنی بڑھانے کے ساتھ ساتھ روزگار کے مواقع فراہم کرنے میں بھی معاون ہے۔ ہندوستانی کونسل برائے زراعتی تحقیق کے ڈائرکٹر جنرل منگلا رائے کے مطابق ''مستقبل میں مویشی ڈاکٹروں اور ماہرین کی مانگ میں مزید اضافہ ہوگا''۔ اس میدان میں روزگار حاصل کرنے کے لیے بی.وی.ایس.سی. (بیچلر ان ویٹرنری سائنس) کی ڈگری لازمی ہے۔

کورس:

مویشیوں کے علاج سے متعلق بی.وی.ایس.سی. کورس میں بطور خاص مویشی اور ڈیری سائنس، مویشیوں کی بیماریوں کی تشخیص اور علاج کے علاوہ مویشیوں کی صحت اور ان کی غذا (چارے) کے انتظام سے متعلق معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ اس میں مویشیوں کی جسمانی بناوٹ، ان کی پیدائش اور مختلف اقسام کے ساتھ ساتھ بیماری پھیلانے والے جراثیم سے متعلق مکمل معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ علاوہ ازیں ان کی مختلف بیماریوں کی روک تھام اور آپریشن سے متعلق بھی واقف کرایا جاتا ہے۔

کورس کی مدت:

آپ بارھویں کلاس پاس کرنے کے بعد بی.وی.ایس.سی. کر سکتے ہیں۔ اس کورس کی مدت پانچ سال ہے۔ اس کے علاوہ چھ ماہ کی تربیت (انٹرن شپ) بھی لازمی ہے جس میں عملی طور پر علاج کے جملہ مراحل سے متعارف کرایا جاتا ہے۔

قابلیت:

بی.وی.ایس.سی. میں اندراج کے لیے امیدوار کی عمر 17 سال ہونی لازمی ہے، علاوہ ازیں علم طبیعیات، علم کیمیا اور علم حیات کے ساتھ بارھویں کلاس یا پھر اس کے مساوی کسی بھی منظور شدہ ادارے یا یونیورسٹی/بورڈ سے پچاس فیصد نمبرات کے ساتھ مع انگریزی کامیاب ہونا ضروری ہے۔

داخلے کا طریقہ:

بی.وی.ایس.سی. میں اندراج کے لیے آپ کو تحریری امتحان سے گزرنا ہوگا، جس میں کامیابی کے بعد ہی داخلہ مل سکتا ہے۔ تمام ویٹرنری کالجوں میں دس سے پندرہ فیصد نشستیں دیگر ریاستوں کے امیدواروں کے لیے محفوظ ہوتی ہیں۔ ان نشستوں کے لیے کل ہند پیمانے پر भारतीय पशु चिकित्सा परिषद کی جانب سے داخلے کا امتحان منعقد کیا جاتا ہے۔ یہ امتحان جون میں منعقد کیا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر امیدواروں کو داخلہ ملتا ہے۔ یہاں پر ہاسٹل کی سہولت بھی فراہم کی جاتی ہے جس میں سالانہ 20 ہزار روپے کا خرچ ہے۔

روزگار کے مواقع:

یہ کورس مکمل کرنے کے بعد روزگار فراہمی کے کافی امکانات ہیں۔ آپ کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری شفاخانے اور چڑیا گھروں میں بحیثیت معالج ملازمت حاصل کر سکتے ہیں علاوہ ازیں ڈیری، بھیڑ بکری اور مرغی اور اونٹ فارموں میں بھی معالج کی حیثیت سے ملازمت کر سکتے ہیں، اس کے ساتھ ہی بینکوں، بیما کمپنیوں اور تحقیقی مراکز میں بھی روزگار کے کافی مواقع فراہم ہیں۔ اس سے قطع نظر خود اپنا کلینک کھول کر بھی بہتر آمدنی حاصل کی جا سکتی ہے۔ غیر ممالک میں بھی متذکرہ جملہ مواقع موجود ہیں۔

روزگار کے میدان:

- سرکاری/غیر سرکاری مویشی شفاخانوں میں۔
- بینک، ایل.آئی.سی. بیما کمپنیوں اور مذبحوں (سلاٹر ہاؤسوں) میں۔
- تحقیقی مراکز، تجربہ گاہوں، دوا کمپنیوں (مثلاً رین بیکسی اور ڈابر وغیرہ میں)۔
- طبی نمائندے کے طور پر کام کر کے بھی آپ کی کافی آمدنی ہو سکتی ہے۔
- ہندوستان سے زیادہ غیر ممالک میں مویشی ڈاکٹروں کی مانگ ہے اور تنخواہ بھی زیادہ ہے۔
- ڈاگ یا پیٹ کلینک کھول کر بھی آپ بہتر آمدنی حاصل کر سکتے ہیں، کسی بہتر علاقے میں ذاتی کلینک کھول کر ماہانہ لاکھ روپے تک کما سکتے ہیں۔

آج کل عوام وخواص پالتو جانوروں کو شوقیہ اور حفاظت کے نقطۂ نظر سے خوب پال رہے ہیں اور انھیں پالنا غیر قانونی بھی نہیں۔ ان میں کتا، بلی اور طوطا وغیرہ شامل ہیں۔ 1982 میں پٹنہ ویٹرینری کالج سے سند یافتہ ڈاکٹر تیج کرشن بھٹ کے مطابق اس پیشے سے آپ کثیر آمدنی حاصل کر سکتے ہیں کیوں کہ پالتو جانوروں کے علاج کے لیے کوئی خاص کورس پاس کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن اگر آپ اس میں مہارت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو ایم. بی. ایس. سی. کی سند حاصل کرنی ضروری ہے۔

اہم تعلیمی ادارے

- کالج آف ویٹرینری سائنس حصار، ہریانہ www.haryanaonline.com
- کالج آف ویٹرینری سائنس، گوہاٹی آسام www.aav.ac.in
- ویٹرینری کالج، پٹنہ بہار۔ ای میل: rav@bih.nic.in
- کالج آف ویٹرینری سائنس اینڈ اینمل ہسبنڈری، جبل پور، مدھیہ پردیش۔
- مدراس ویٹرینری کالج، ویپری، چنئی www.tanuvas.com
- کالج آف ویٹرینری سائنس اینڈ اینمل ہسبنڈری، متھرا، یو. پی.
- ممبئی ویٹرینری کالج، پریل، ممبئی، مہاراشٹر www.mafsu.com
- کالج آف ویٹرینری سائنس، تروپتی، آندھرا پردیش www.angrau.nest

(بہ شکریہ روزنامہ "ہندوستان" 26 اپریل 2006)

□□□

دیوان آبرو

مرتب: ڈاکٹر محمد حسن

شاہ مبارک آبرو کا کلام شمالی ہند کی اردو شاعری کی اولین یادگاروں میں سے ہے اور اپنے دور کی عکاسی کے اعتبار سے صحیح معنوں میں گویا مرقع دہلی ہے اور جمالیاتی کیف سے بھی خالی نہیں ہے۔ یہ دیوان ڈاکٹر محمد حسن نے کلیات آبرو کے چند دستیاب مخطوطوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا ہے اور اس پر مفصل مقدمہ بھی لکھا ہے۔ آخر میں فرہنگ بھی دی گئی ہے۔ جو طلبہ اور اساتذہ دونوں کے لیے یکساں اہمیت کی حامل ہے۔

صفحات: 377، قیمت: -/25 روپے

دستنبو

مصنف: مرزا غالب، مترجم: خواجہ احمد فاروقی

یہ مرزا غالب کی مشہور فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے جو خواجہ احمد فاروقی نے کیا ہے۔ کتاب ان واقعات کے دیدہ وشنیدہ احوال کے بیان پر مبنی ہے جو 1857 کی قومی بغاوت کے دنوں میں دارالسلطنت دہلی میں رونما ہوئے۔

صفحات: 88، قیمت: -/12 روپے

افغانستان میں جدید دری (فارسی) شاعری

مصنف: ڈاکٹر غلام محمد لعل زاد

یہ کتاب ڈاکٹر غلام محمد لعل زاد کے فارسی تحقیقی مقالے پر مبنی ہے جسے ڈاکٹر شعیب اعظمی نے اردو کا جامہ پہنایا ہے، اس کے مطالعے سے افغانستان کی جدید فارسی شاعری اور موجودہ دور کے اہم شاعروں سے واقفیت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کے طلبہ اور فارسی زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والے شائقین کے لیے یہ کتاب ایک اہم تحفے سے کم نہیں۔

صفحات: 317، قیمت: -/80 روپے

پرواز

مصنف: ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام
ترجمہ اور تلخیص: گلزار (نقل حرفی۔ فرحانہ محمود)

صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے. پی. جے. عبدالکلام کی خودنوشت سوانح عمری "پرواز" نہ صرف ڈاکٹر کلام کی نجی زندگی کی روداد ہے بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں آزاد ہندوستان کی تدریجی پیش رفت کی کہانی بھی بیان کرتی ہے۔ ان ولولہ انگیز واقعات وحقائق پر مشہور مصنف اور فلم ڈائرکٹر جناب گلزار نے یہ دلچسپ سی. ڈی. (آڈیو ورژن) تیار کی ہے۔

قیمت (کتاب مع سی. ڈی.): -/175 روپے

نوٹ: طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

پنیت گیر، استوتی ترہان، سمراٹ شرما

"C ایڈونچر" سے ماخوذ

لیفٹ اور سی

پوائنٹرس

آپریٹر کا پتہ

جب آپ اپنے پروگرام میں کسی ویریبل (variable) کو واضح کرتے ہیں تو کمپیوٹر اس ویریبل کے لیے غیر استعمال شدہ میموری (memory) کو اس کے لیے مخصوص کر دیتا ہے۔ یہ مخصوص کی گئی میموری اس ویریبل کے نام سے ہی جانی جاتی ہے اس لیے اس ویریبل کا نام غیر مثالی ہونا چاہیے۔

لیکن کیا اس میموری کی جگہ آپ کے کمپیوٹر میں کہاں ہے، جاننا چاہتے ہیں۔ ہم & operator کا استعمال کر سکتے ہیں جیسے آپریٹر کا پتہ ("address of" operator) کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اب اس کے لیے ایک چھوٹا سا پروگرام چلاتے ہیں:

```
#include <stdio.h>
int main()
{
int number = 0;
printf("The address of the variable called number is
ox%p\n", &number);
return 0;
}
```

یہ پروگرام میموری (memory) کا پتہ بتاتا ہے۔ یہاں ویریبل جو نمبر کہلاتا ہے، اسٹور (store) کیا گیا ہے۔ ہم نے یہ آؤٹ پٹ (output) اس میں استعمال کوڈ سے پایا ہے۔

اس میں ویریبل (variable) کا پتہ 0x0065FDF4 ہے۔

یاد رکھیں ایڈریس آف آپریٹر ایک ہیکزاڈیسیمل (hexadecimal) نمبر آیا ہے۔ اس لیے '0x' یہ بتانے کے لیے جڑا ہوا ہے کہ یہ نمبر ہیکزاڈیسیمل ہے۔ '%p' کا استعمال ویریبل کے میموری کے پتے کو پرنٹ (print) کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔

آپ scanf() میں ایڈریس آف آپریٹر طریقہ کو یاد کریں۔ scanf("%d",&x);

اس کو ہم لفظوں میں پڑھ سکتے ہیں۔

"take the inputted integer and take it to the address of the variable called x and store it".

پوائنٹرس

یہ وہ ویریبلس (variables) ہیں جو دوسرے ویریبل کے میموری ایڈریس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

جب آپ ایک پوائنٹر کو واضح کرتے ہیں تو اس کی قسم کو بتاتے ہیں۔ اس کے بعد ڈفرینس آپریٹر (DEREFERENCE operator) پوائنٹر کا نام یہ ویریبل نام رکھنے کی ہی طرز پر کام کرتا ہے۔ پوائنٹر کا نام شروع کرنے کے لیے دوسرے ویریبل کے حصے کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ اس میں ایڈریس آف آپریٹر ("address of" operator) کا استعمال ہوتا ہے۔

اس کی مثال مندرجہ ذیل ہے:

```
#include<stdio.h>
int main()
{
int x = 10;
int *pointer_to_x;
pointer_to_x = &x;
/* int *pointer_to_x = &x; is a simplified way */
printf("The address of x is 0x%p and the data it holds is
%d\n", &x, *pointer_to_x);
return 0;
}
```

اس کوڈ کا آؤٹ پٹ بھی ایک کمپیوٹر سے دوسرے کمپیوٹر میں مختلف ہو سکتا ہے۔ اس کا ایڈریس آف (address of) x ہے۔ 0x0065FDF4 اور اس کا ڈیٹا 10 ہے۔

int *address = number; اس طرح کی معمولی غلطی بھی نہ کیجیے۔

پوائنٹرس اور اریز

پوائنٹرس (Pointers) کا استعمال کیوں کریں؟ اگر میں اپنی پرانی مثال حالانکہ وہ اچھی نہیں ہے کو مدنظر رکھوں تو آسانی کے لیے پوائنٹر کا استعمال نہ کروں۔

لیکن پوائنٹرس (Pointers) کی اہمیت دستک دینے لگتی ہے جب اریز کے استعمال کی باری آتی ہے۔

یہ اپنے آپ میں ایک ثبوت ہے کہ ایرے کا نام بھی ایک پوائنٹر ہے۔ کیونکہ ایرے کا پہلا ایلیمنٹ (element) اس کے نام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اس کو مرتب کرنے کی کوشش کریں۔ مثال کے طور پر 10 سائز کے ایرے کو شروع کریں۔ ہم دیکھیں گے کہ کمپیوٹر 10 لگاتار غیر استعمال شدہ میموری سلاٹس (memory slots) کو دکھاتا ہے اور اس میں اس کی ویلیو (value) اسٹور رہتی ہے۔ ایرے کا نام ہی اس کی بنیاد ہے۔ اس کا پہلا سلاٹ (slot) ہی پورے ایرے (array) کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پوائنٹر بھی C پروگرامرس کے لیے اتنا اہم ہے۔

اسٹرکچر

آپ اپنے ذہن کو واپس ایرے کی طرف متوجہ کریں۔ آپ پائیں گے کہ ایک ہی طریقے کے ویریبل (variable) کو اسٹور (store) کرنے کے لیے بہت ساری شاندار ایجادات منظر عام پر آ چکی ہیں۔ لیکن مختلف طریقوں کے ویریبل کو اگر ہم اسٹور کرنا چاہتے ہیں تو کیا کیا جا سکتا ہے؟ ایرے کی طرح سے ایک تصویر (structure) ویریبلس (variables) کو یکجا کرنے کے لیے بھی سوچا جا سکتا ہے۔ کسی بھی تصویر کا ویریبل فیلڈ FIELDS یا ممبرس (MEMBERS,) کی طرح لکھا جا سکتا ہے۔ جب کہ ایرے میں ایلیمنٹس (ELEMENTS) ہوتے ہیں اس میں اسٹرکچر فیلڈ (structure field) کو بھی دکھایا جا سکتا ہے۔ اگر آپ ڈوٹ آپریٹر (dot operator) کا استعمال کر رہے ہوں تو ایرے کے ساتھ انڈیکس (index) نمبر کا استعمال ہوتا ہے۔

ڈکلیئرنگ اسٹرکچر

اس کے لیے آپ کو اسٹرکٹ کی ورڈ (struct keyword) کی ضرورت پڑے گی۔ آپ کو یہ بھی سوچنا ہے کہ اسٹرکچر کا نام اور اس کی فیلڈس (fields.) کیا ہوں جہاں اس کے نام رکھنے کی باری آ گئی وہیں پر اس طریقے کی بھی ضرورت پڑے گی جس کے بارے میں پہلے بھی آپ کو بتایا گیا ہے۔ اس شکل (form) کی وضاحت مندرجۂ ذیل طریقہ سے کی جا سکتی ہے۔

```
struct structure_name {
data_type 1 filed_name1;
data_type2 field_name2;
data_type3 field_name3; /* and so on....*/
};
```

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اس کا ڈیٹا مختلف ہو سکتا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اس اسٹرکچر میں ایرے کا بھی استعمال کر سکتے ہیں جیسے کہ کیریکٹر ارے BUT لیکن اس کے سائز کا طے ہونا ضروری ہے۔

آپ یہ بھی نہ بھولیں کہ سیمی کولن (semi-colon) کا استعمال ہر بریکیٹ کے بعد ہوا ہے۔

اسٹرکچر کی مثال:

```
struct human {
char name [20];
int age;
float height;
};
struct dog {
char name [20];
int age [2]; /* one element is the year, the other is the
month */
char breed [32];
};
```

پروگرام کے شروع میں ہی ان سبھی کو مین فنکشن (main() function) آؤٹ سائڈ (OUTSIDE) قرار دے دینا چاہیے۔

اسٹرکچر ویریبلس کو واضح کرنا

ابھی تک ہم نے آپ کو یہ بتایا ہے کہ کیسے اسٹرکچر کو واضح کیا جاتا ہے۔ اب ہم آپ کو اسٹرکچر ویریبل (structured variable) کو واضح کرنے کا طریقہ بتائیں گے۔

اس کا طریقہ یہ ہے کہ:

```
There are 2 ways of doing this:
struct robot {
char name [20];
int energy;
} level_1_Boss, blue_one;
```

یا

```
struct robot level_2-boss;
```

یہاں پر ہم نے روبوٹ اسٹرکچر (robot structure) کی تشریح کی ہے۔ اس کے بعد دو روبوٹ ویریبلس (2 "robot" variables) کو واضح کیا اس میں سے پہلا بریکیٹ بند ہونے کے بعد واضح کیا گیا ہے۔ (یہاں سیمی کولن لگانا مت بھولیے) آخر کے لیے پھر اسٹرکٹ روبوٹ ("struct"

"robot") ٹائپ کریں گے۔

اسٹرکچر ویری ایبلس کی شروعات

یہ مثال آپ کو بتاتی ہے کہ کیسے اسٹرکچر (structure) کی شروعات اور اس میں قیمت داخل (enter) کریں۔ میں نے ٹائپڈ الف اسٹیٹمنٹ (typedef statement) کا استعمال کیا ہے۔ جس میں اسٹرکچر کا نام اپنے آپ ہی آپ کو واضح کرتا ہے۔

```
#include<stdio.h>
int main()
{
int m;
typedef struct human HUMAN;
struct human{
char name[20];
int age[2];
} user;
printf("What is your name?");
gets(user.name);
printf("\nHow old are you?\nYears:");
scanf("%d", &user.age[0]);
printf("\nMonths:");
scanf("%d", &user.age[1]);
m = user.age [1];
printf("\nYour name is %s and you are", user.name);
printf("%d years and %d %s old.\n", user.age[0],m,
(m==1? "month" : "months"));
return 0;
}
```

نام اور اوپر کی انٹری (entry) کے بعد اس کوڈ کا آؤٹ پٹ (output) ہوگا:

```
What is your name?
Happy Singh
How old are you?
Years: 41
Months: 6
Your name is Happy Singh and your are 41 years and 6
months old.
```

□□□

حیات جاوید

مصنف: الطاف حسین حالی

مولانا الطاف حسین حالی نہ صرف ایک رجحان ساز شاعر اور نقاد تھے بلکہ انھوں نے سوانح نگاری میں بھی اپنا لوہا منوایا اور "حیات سعدی"، "یادگار غالب" اور "حیات جاوید" جیسی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ "حیات جاوید" میں حالی نے سرسید کی زندگی کے حالات، افکار اور خیالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت یوں بھی ہے کہ حالی سرسید سے بے حد قریب تھے اور سرسید نے ملک وقوم کی جو خدمت کی اس کے عینی شاہد۔

پانچواں ایڈیشن، صفحات: 907، قیمت: -/181 روپے

کلیات چودھری محمد علی ردولوی (تین جلدوں میں)

ترتیب وتدوین: مسعود الحق

چودھری محمد علی ردولوی اپنے زمانے کے ایک روشن خیال اور شگفتہ نگار ادیب تھے۔ ان کا تعلق انیسویں صدی کے ادیبوں کی اس نسل سے تھا جس میں ولایت علی بمبوق، سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، مولانا ابوالکلام آزاد اور نیاز فتحپوری وغیرہ شامل تھے۔ اس کلیات میں ان کی تمام تحریریں جمع کردی گئی ہیں۔

جلد اوّل، صفحات: 344، قیمت: -/172 روپے
جلد دوم، صفحات: 455، قیمت: -/172 روپے
جلد اوّل، صفحات: 450، قیمت: -/172 روپے

نوٹ: طلبه اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو سب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110 066

اردو خبر نامہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار برقرار

● نئی دہلی، 24 اپریل۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی 1981 میں کی گئی آئینی ترمیم کے مطابق بدستور اقلیتی ادارہ رہے گی۔ جسٹس کے جی بال کرشنن اور جسٹس ڈی کے جین پر مشتمل بنچ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور مرکزی حکومت کی طرف سے دائر کی گئی عرضی پر نوٹس جاری کرتے ہوئے یہ معاملہ پانچ رکنی آئینی بنچ کو سونپ دیا ہے۔ عرضی کو ساعت کے لیے داخل کرتے ہوئے سپریم کورٹ نے ہدایت دی ہے کہ الہ آباد ہائی کورٹ میں جس روز عرضی داخل کی گئی، اس روز یونیورسٹی کی جو پوزیشن تھی، وہ تا حکم ثانی برقرار رہے گی۔ یونیورسٹی کی طرف سے پیروی کرتے ہوئے سینئر وکیل سولی سوراب جی اور راجیو دھون نے کہا کہ الہ آباد ہائی کورٹ نے فیصلہ دے کر یونیورسٹی کے اس اقلیتی کردار کو ختم کرنے کی بات کہی ہے، جو 1920 میں یونیورسٹی کے قیام سے اسے حاصل ہے۔

درخواست دہندہ کے وکیل نے عدالت سے یہ بھی کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے مختلف پیشہ ورانہ کورس شروع کر رکھے ہیں اور اگر ہائی کورٹ کے اس فیصلے پر عمل درآمد نہیں روکا گیا تو یونیورسٹی کے لیے مزید مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ درخواست دہندگان نے عدالت سے یہ بھی کہا کہ یونیورسٹی کے نام (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک اقلیتی ادارہ ہے۔ تاہم عدالت نے ہدایت دی ہے کہ یونیورسٹی میں 60فی صد سیٹیں مسلم طلبہ کے لیے مخصوص کرنے کے معاملے پر 07-2006 کے تعلیمی سال میں عمل نہیں ہوگا۔ تاہم مدعا علیہ کے وکیل نے عدالت سے کہا ہے کہ 1981 میں جو آئینی ترمیم کی گئی تھی، اس کا مقصد سپریم کورٹ کے اس فیصلے کو کالعدم کرنا تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اقلیتی ادارہ نہیں ہے کیوں کہ اس یونیورسٹی کا قیام مرکز کی طرف سے بنائے گئے قانون کے تحت عمل میں آیا ہے۔ ایڈیشنل سالسٹر جنرل گوپال سبرامنیم نے مرکز کی طرف سے پیروی کرتے ہوئے سپریم کورٹ کے اس موقف کی حمایت کی کہ اگر ہائی کورٹ کے حکم پر حکم امتناعی جاری نہیں کیا گیا تو 1981 تک یونیورسٹی کا جو درجہ تھا، وہ بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ الہ آباد ہائی کورٹ کے فیصلے کے بعد مختلف تنظیموں اور یونیورسٹی کے طلبہ کی جانب سے زبردست احتجاج کیا گیا تھا۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

''حدیث ہند در ادبیات فارسی'' سہ روزہ سیمینار

● علی گڑھ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کی جانب سے ''حدیث ہند در ادبیات فارسی'' پر تین روزہ عالمی سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے اردو کے ممتاز نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ ہندوستان میں فارسی کے بہت سے ممتاز عالم اور اسکالر پیدا ہوئے جن میں امیر خسرو کا نام سب سے اہم ہے۔ انھوں نے کہا کہ خود جہانگیر نے ایران کے بہت سے شاعروں کو ہندوستان میں مدعو کیا۔

جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے یہ بھی کہا کہ زبان ماں کی آغوش میں پرورش پاتی ہے جب کہ ادب مطالعے سے حاصل ہوتا ہے۔ انھوں نے فارسی زبان و ادب کے میدان میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی خدمات کو اجاگر کرتے ہوئے کہا کہ علامہ شبلی نعمانی فارسی کے ممتاز عالم تھے۔ پروفیسر ہادی حسن اور مولانا ضیاء الدین بدایونی کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ خود ایران کے ابو طالب نے آگرہ اور ظہوری نے حیدرآباد پر بہت کچھ لکھا ہے۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے ممتاز مورخ اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے سابق صدر پروفیسر ستیش چندرا نے کہا کہ فارسی ہندوستانی تہذیب کا ایک اٹوٹ حصہ ہے اور یہ محض ایک زبان ہی نہیں ہے بلکہ مکمل تہذیب ہے جو ہمارے ملک کے مقدس دریاؤں جیسے گنگا جمنا، نرمدا، گوداوری، جھیلم اور گومتی کے کناروں پر پھلی پھولی۔ فارسی ادب کے مطالعے کے بغیر ہندوستانی تہذیب کا مطالعہ نامکمل ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کے رسم و رواج، کھانے پینے کے طریقے، لباس، زیورات، تہوار جیسے ہولی، دیوالی، دسہرا، بسنت، رمضان، شب برات وغیرہ کا ذکر فارسی ادب میں ہر جگہ نظر آتا ہے۔ اس سے قبل سیمینار کی ڈائرکٹر پروفیسر آذرمیدخت صفوی نے تمام مندوبین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور ثقافتی صورتحال پر ایران میں بہت کچھ لکھا گیا جو آج بھی ہندوستان کے عجائب گھروں میں محفوظ ہے۔ انھوں نے کہا کہ نویں صدی سے ہی ایران کے سیاح اور دانشوروں نے ہندوستان کے بارے میں لکھنا شروع کیا۔

ایران کے ثقافتی کونسلر ڈاکٹر ایم شفیع شکیب، پروفیسر ایس آر دیاس اور تہران یونیورسٹی کے پروفیسر محمود علی نے بھی جلسے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ افتتاحی جلسے کی صدارت کرتے ہوئے جناب نسیم احمد وائس چانسلر نے کہا

کہ ہندوستان نے مختلف تہذیبوں کو پروان چڑھایا ہے اور تقریباً آٹھ سو سال تک فارسی اس ملک کی قومی زبان رہ چکی ہے۔ فارسی نے پوری طرح سے ہندوستانیت کو اپنا لیا اور گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستانی فلسفہ، فن تعمیر، موسیقی، تہوار، انتظام و انصرام پر فارسی کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ آئین اکبری اور تزک جہانگیری ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور ثقافتی زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ شعبے کی سربراہ پروفیسر ماریہ بلقیس نے مندوبین کا خیر مقدم کیا اور ڈاکٹر آصف نعیم صدیقی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

''اردو میں معاصر ادب'' پر سیمینار

● علی گڑھ، 26 مارچ۔ شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے 26-25 مارچ کو ''معاصر اردو ادب'' کے موضوع پر آرٹس فیکلٹی لاؤنج میں ایک دو روزہ سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا جس کے افتتاحی اجلاس کا کلیدی خطبہ پروفیسر شمیم حنفی نے پیش کیا اور صدارت پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے کی۔ سیمینار کے کوآرڈینیٹر پروفیسر محمد زاہد نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

صدر شعبۂ اردو پروفیسر قاضی افضال حسین نے اپنی استقبالیہ تقریر میں سیمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ اس اجلاس میں پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے ''متبادل ادبی نظریے کی تلاش'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا۔

سیمینار کا پہلا اجلاس ممتاز ناول نگار پروفیسر قاضی عبدالستار کی صدارت میں شروع ہوا۔ اس کی نظامت ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی نے کی۔ اس اجلاس میں شعبے کی ریسرچ اسکالر مبشرہ نے ''ہند و پاک کی ہم عصر شاعرات''، جمیرا محمود آفریدی نے ''معاصر اردو شاعری کا نسائی لہجہ''، ڈاکٹر امتیاز احمد نے ''معاصر اردو غزل میں احتجاج کی لے''، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے ''مطالعات غالب کی صورتحال''، پروفیسر عقیل احمد نے ''نظم کی موجودہ صورتحال''، پروفیسر سید محمد امین نے ''معاصر اردو غزل اور عرفان صدیقی کی غزلوں کا علامتی نظام'' اور پروفیسر قاضی جمال حسین نے ''معاصر نظم'' کے زیر عنوان مقالے پیش کیے۔

سیمینار کا دوسرا اجلاس 26 مارچ کی صبح شروع ہوا جس کی صدارت پروفیسر شمیم حنفی نے کی اور اس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر صغیر افراہیم نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر ناز بیگم، ڈاکٹر راشد انور راشد نے ''معاصر تنقید کے امتیازات''، ڈاکٹر دردانہ قاسمی نے ''خواتین کی نمائندہ آپ بیتیاں''، ڈاکٹر محمد علی جوہر نے ''خودنوشت کا فن اور ارتقا''، پروفیسر قاضی افضال حسین نے ''تھیوری/ادبی تھیوری''، پروفیسر محمد زاہد نے ''رشید حسن خاں کے تدوینی کارنامے''، پروفیسر خورشید احمد نے ''معاصر ترقی پسند اردو تنقید—ایک جائزہ'' اور ڈاکٹر سید سراج الدین اجملی نے ''معاصر ادبی صورتحال غزل کے حوالے سے'' مقالات پیش کیے۔

تیسرے اور آخری اجلاس کی صدارت پروفیسر ثریا حسین نے کی اور اس کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے انجام دیے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر سیما صغیر نے ''آج کی خواتین افسانہ نگاروں کی نگارشات''، ڈاکٹر اقبال حسین صدیقی نے ''ہندوستان میں ہمعصر اردو ناول (موضوعات کی روشنی میں)''، ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی نے ''داستان کی شعریات: بعض مباحث''، پروفیسر سید محمد ہاشم نے ''بیسویں صدی میں تحقیق و تدوین''، ڈاکٹر خالد سیف اللہ نے ''عصر حاضر میں اردو خاکہ نگاری کی صورتحال''، ڈاکٹر طارق چھتاری نے ''نئے افسانے کی بدلتی ہوئی زبان'' اور ڈاکٹر صغیر افراہیم نے ''بیان و بیانیہ کی آویزش اور اردو افسانہ'' کے عنوان سے مقالے پیش کیے۔ آخر میں پروفیسر قاضی افضال حسین نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں سیمینار

● بھوپال، 29 اپریل۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی علاقائی شاخ بھوپال کی جانب سے ایک روزہ سیمینار بعنوان ''مدھیہ پردیش اور چھتیس گڑھ میں اردو ذریعۂ تعلیم و امکانات'' منعقد کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے جناب بلرام جاکھڑ، گورنر مدھیہ پردیش نے کہا کہ اردو ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور ثقافت کی زبان ہے اور یہی وہ زبان ہے جو دلوں کو جوڑتی ہے۔ اردو کے فروغ سے کسی اور زبان کو کوئی نقصان نہیں ہوسکتا لہٰذا اس زبان کے ساتھ تعصب نہیں برتا جانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ اکیسویں صدی تعلیم کی صدی ہے جو قوم تعلیم کے میدان میں جتنا آگے جائے گی اتنا ہی علم کا خزانہ اس کے ہاتھ آئے گا اور وہ ترقی کی منازل اسی تناسب سے طے کر سکے گی۔ انھوں نے کہا کہ تعلیم اگر اپنی مادری زبان میں حاصل کی جائے تو علمی صلاحیت پختہ ہوتی ہے۔ اس موقع پر صدارتی تقریر کرتے ہوئے عزیز قریشی نے کہا کہ تحفظ و ترقی کی منزل حاصل کرنے کے لیے اردو کی تعلیم بھی ایک طاقتور ذریعہ ہے۔ انھوں نے یونیورسٹی کے ذمہ داروں سے کہا کہ وہ اردو کو معاشیات و اقتصادیات کی تعلیم سے وابستہ کر کے اردو زبان کے فروغ کے امکانات کو روشن کریں۔

اس موقع پر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر اے۔ ایم۔ پٹھان نے کہا کہ یونیورسٹی اپنے ٹیکنیکل کورسوں کے علاوہ آئندہ تعلیمی سال سے بی ایڈ اور ڈی ایڈ کورسوں کی تعلیم بھی شروع کرنے جا رہی ہے جن کی تعلیم اور داخلہ جات کی نگرانی یونیورسٹی کی تمام علاقائی شاخیں کریں گی۔

افتتاحی اجلاس کے بعد سیمینار کا آغاز ہوا جس کے تین اجلاس منعقد ہوئے۔ جلسوں کی مختلف نشستوں میں صدارت کے فرائض پروفیسر عبدالحلیم خاں، پروفیسر آفاق احمد اور پروفیسر اے۔ایم۔ پٹھان نے انجام دیے جب کہ مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر ذکی الدین، پروفیسر وحید خاں، قاضی سید مشتاق علی ندوی، ڈاکٹر حیدر عباس رضوی، ڈاکٹر شاہد ناگوری، مفتی حبیب یار خاں، ڈاکٹر آئی۔ یو۔ خاں، اکبر علی فاروقی کے نام قابل ذکر ہیں جب کہ مقالات پر بحث میں حصہ لینے والوں میں ڈاکٹر حمید اللہ ندوی، ڈاکٹر اخلاق اثر، نسیم انصاری ایڈووکیٹ، اقبال مسعود ندوی، ڈاکٹر مختار شمیم، مسعود الحسن، ڈاکٹر کے آر اقبال، فاروق احمد، ڈاکٹر ماجد حسین، حاجی ہارون اور عارف عزیز کے نام قابل ذکر ہیں۔
(عالمی سہارا، نئی دہلی)

ذرائع ابلاغ پر سیمینار

● نئی دہلی، 19 اپریل۔ ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کی جانب سے عوامی ذرائع ابلاغ کے عنوان کے تحت ایک دو روزہ سیمینار منعقد کیا گیا جس کا افتتاح یونیورسٹی کے وائس چانسلر بی بی بھٹا چاریہ نے کیا۔ ابتدائی کلمات صدر شعبہ پروفیسر شاہد حسین نے ادا کیے۔ اس موقعے پر بی بی بھٹا چاریہ نے کہا کہ ماس میڈیا ہماری ضرورت بن گیا ہے اور اسے ہم کسی بھی طرح غیر اہم قرار نہیں دے سکتے۔ اس موقعے پر دہلی دور درشن کے ڈائرکٹر شردت نے پبلک براڈ کاسٹنگ پر لیکچر دیتے ہوئے کہا کہ پبلک براڈ کاسٹنگ ہماری تہذیب و ثقافت کے فروغ میں شروع سے ہی نمایاں کردار انجام دے رہا ہے۔

بی بی سی کے سابق نامہ نگار قربان علی نے کہا کہ اخباروں، ریڈیو اور دور درشن کی زبان میں بہت حد تک گراوٹ آئی ہے اور ہم زبان کو صحیح طور پر استعمال کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اس کی وجہ غیر ذمہ داری اور جلد بازی ہے کیونکہ اکثر ایسی خبریں نشر ہو جاتی ہیں جن کی زبان درست نہیں ہوتی۔ انھوں نے کہا کہ ایسے حالات میں تعلیم یافتہ طبقے کو آگے آکر اہم کردار نبھانا چاہیے۔ صدر جلسہ پردیپ ماتھر نے کہا کہ ہمارے یہاں صحافتی سطح پر جو تنزلی آئی ہے اس کو پر کرنے کی ضرورت ہے۔ آخر میں ڈاکٹر مظہر حسین نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

عوامی ذرائع ابلاغ کے موضوع پر منعقدہ دو روزہ سیمینار کے آخری دن 19 اپریل کو ریوتی شرن شرما نے خصوصی خطبہ پیش کیا۔ قبل ازیں پروفیسر محمد شاہد حسین نے کہا کہ آج دنیا میڈیا کی وجہ سے عالمی گاؤں بن کر رہ گئی ہے۔ اسی کے پیش نظر اس سیمینار میں میڈیا سے وابستہ اہم لوگوں کو خطبہ پیش کرنے کے لیے زحمت دی گئی۔ پروگرام کی صدارت ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے کی۔

ریڈیو پروگراموں خصوصاً ریڈیو ڈراموں پر اظہار خیال کرتے ہوئے ریوتی شرن شرما نے کہا کہ ریڈیو کے لیے لکھتے وقت ہمیں عام لوگوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ خصوصاً ان لوگوں کا جو کھیتوں اور کھلیانوں میں کام کرتے ہیں، چائے خانوں میں بیٹھ کر پروگرام سنتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ریڈیو براڈ کاسٹر عام فہم الفاظ کا استعمال کریں۔ انھوں نے الفاظ، آواز اور ان کی نشست و برخاست کے حوالے سے ریڈیو براڈ کاسٹنگ کی اہمیت بیان کی۔ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے ریڈیو، اخبارات اور ٹیلی ویژن کی زبان اور اس کی افادیت پر روشنی ڈالی۔
(قومی آواز، نئی دہلی)

اردو یونیورسٹی میں ''اردو میوزیم'' کا سنگ بنیاد

● حیدرآباد، 29 اپریل۔ اردو کو پوری دنیا میں ترسیل کی سب سے اہم اور موثر ترین زبان کا درجہ حاصل ہے لہٰذا اردو والے سہ لسانی نہ سہی ذولسانی فارمولا قبول کریں تاکہ دنیا کی تیز رفتار ترقی کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کر سکیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر سیف الدین سوز مرکزی وزیر آبی وسائل نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد میں اردو میوزیم کا سنگ بنیاد رکھنے کے بعد طلبہ، اساتذہ اور اراکین سے خطاب کے دوران کیا۔ وائس چانسلر پروفیسر اے۔ایم۔ پٹھان نے اس تقریب کی صدارت کی۔

پروفیسر سوز نے کہا کہ اردو گنگا جمنی تہذیب کی ایک بڑی علامت ہے۔ اس زبان نے ہندوستان کی آزادی میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے سائنس اور ٹکنالوجی کی اس صدی میں اردو زبان میں عصری علوم کی کماحقہٗ منتقلی کو ایک زبردست چیلنج سے تعبیر کرتے ہوئے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی جانب سے ملک کے گوشے گوشے میں اردو ذریعۂ تعلیم کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کی فراہمی کو ایک اہم کارنامہ قرار دیا۔ پروفیسر اے۔ایم۔ پٹھان نے دو کروڑ روپے کی لاگت سے قائم کیے جانے والے اردو میوزیم کو یونیورسٹی کے لیے ایک اہم سنگ میل قرار دیا۔
(قومی آواز، نئی دہلی)

اردو ویب ڈاٹ آرگ پر ڈیجیٹل لائبریری کا منصوبہ

● حیدر آباد۔ اردو کی کتابوں کو انٹرنیٹ پر آن لائن فراہم کرانے کے مقصد سے اردو ویب ڈاٹ آرگ (http://urduweb.org) پر ڈیجیٹل لائبریری کا منصوبہ بنایا گیا ہے جہاں ہر موضوع کی اردو کتابیں اردو تحریر کی صورت میں مہیا کی جائیں گی۔ جناب اعجاز عبید کی اطلاع کے مطابق اردو کی بیشتر ویب سائٹیں در اصل اردو زبان کی نہیں بلکہ اردو کے ایک مقبول سافٹ ویئر ان پیج سے حاصل کی ہوئی تصویروں سے بنائی گئی ہیں۔ یہ تصویریں نہ صرف لوڈ ہونے میں وقت لیتی ہیں بلکہ تصویری کی صورت ہونے کی وجہ سے ان

کے صفحات کو انگریزی کی طرح کاپی اور پیسٹ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی تلاش بھی انٹرنیٹ پر نہیں کی جاسکتی۔ حال ہی میں کمپیوٹر کی دنیا میں تکنیکی ارتقا کے باعث اب ہر زبان میں کمپیوٹر پر کسی مخصوص سافٹ ویئر کے بغیر ٹائپ بھی کیا جاسکتا ہے، ای میل بھی کیا جاسکتا ہے اور ویب سائٹیں بھی بنائی جاسکتی ہیں۔ اس تکنیک سے بنی فائلیں بھی چھوٹی ہوتی ہیں اور آسانی سے ڈاؤن لوڈ کی جا سکتی ہیں۔

اردو ویب ڈاٹ آرگ مکمل تحریری اردو کی پہلی ویب سائٹ ہے۔ اور یہاں ہی لائبریری کا پروجیکٹ شروع کیا گیا ہے۔ یہاں رضا کارانہ بنیاد پر اردو ویب کی فورم 'اردو محفل' کے ارکان کتابیں ٹائپ کر رہے ہیں۔ کچھ کتابیں مکمل ہو چکی ہیں اور کچھ پر کام چل رہا ہے۔ منتخب کتابیں یا تو کاپی رائٹ سے آزاد ہیں، یا مصنفین/ ناشرین سے اجازت کے بعد شائع کی جاتی ہیں۔

اس عمل میں تیزی لانے کے لیے اردو ویب کے ذمہ داران نے اردو داں طبقے سے تعاون و اشتراک کی گزارش کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ اردو کتابوں کی کمپیوٹر فائل اس ویب سائٹ پر بھیج سکتے ہیں نیز اردو کی اہم کتابیں بھی کمپوز کرا کے ارسال کی جاسکتی ہیں۔ اس سلسلے میں اعجاز عبید ڈائرکٹر، جیالوجیکل سروے آف انڈیا۔ سیمنری ہلس، ناگپور۔ 440006 فون: 0712-2510484 موبائل: 09371043529 یا 9-1-25/A/1، ہاشم نگر، لنگر حوض، حیدرآباد۔ 500008 فون: 040-23526002 ای میل: aijazubaid@gmail.com/aijazakhtar@gmail.com سے رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ (ڈاک سے)

بینکوں سے اردو کے چیک قبول کرنے کا مطالبہ

● الہ آباد۔ اتر پردیش اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے قومی اعزازی جنرل سکریٹری (انتظامیہ) ڈاکٹر پرواز علوم کا اردو میں پر کیا ہوا چیک اسٹیٹ بینک آف انڈیا نے لینے سے انکار کر دیا لیکن قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے وائس چیرمین جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا اردو میں پر کیا ہوا چیک اورینٹل بینک آف کامرس نے قبول کر کے اس کی ادائیگی محمد اختر چوڑی والا کو کردی۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت کے بینکوں میں دوسری علاقائی زبان/سرکاری زبان اردو کے قانون کا نفاذ نہیں کیا جا رہا ہے۔ ایک بینک مرکزی حکومت کے قوانین پر عمل کر رہا ہے اور دوسرا نہیں۔

اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے بانی اور کنوینر بحر العلوم نے اپنے بیان میں کہا کہ تنظیم کی کارکردگی کو دیکھتے ہوئے اس میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور جناب سید فرحت علی شامل ہوئے ہیں جو تنظیم کے لیے باعث فخر ہے۔ بحر العلوم نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور ہندوستان کی اردو اکادمیوں سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے چیک میں اردو زبان کا ہی استعمال کریں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ تمام اقلیتی اداروں مع مدارس سے اپیل کی ہے کہ وہ طلبہ کو وظیفہ دینے والے چیک میں اردو کا استعمال کریں تاکہ طالب علموں کو یقین ہو سکے کہ اردو میں پر کیا ہوا چیک بینکوں میں قبول کیا جاتا ہے۔ (ڈاک سے)

اقبال کی یاد میں جلسہ

● بھوپال، 21 اپریل۔ اقبال مرکز ساہتیہ اکادمی مدھیہ پردیش سنسکرتی پریشد کی جانب سے علامہ اقبال کے 49ویں یوم وفات پر ایک جلسہ منعقد کیا گیا جس میں جناب اقبال مجید نے ''ذوق تماشائے روشنی اور اقبال''، ڈاکٹر قاسم نیازی نے ''مثنوی جاوید نامہ اور ٹیپو سلطان'' اور پروفیسر عبدالمجید خاں نے'' اقبال اور افغانستان'' کے زیر عنوان مقالے پیش کیے۔

اس موقعے پر پروفیسر آفاق احمد نے کہا کہ آج اقبال کی معنویت پہلے سے کہیں زیادہ اور انسانیت کے لیے ضروری ہے، اس موقع پر شعری نشست میں جناب اختر سعید خاں، عشرت قادری، منظر بھوپالی، ظفر صہبائی، رضا رامپوری، کوثر صدیقی، نسیم انصاری، حسن فتح پوری، مسعود رضا، احد پرکاش، گووند آریہ نشاد، وجے تیواری، تمنا لکھنوی اور پروین کیف نے اپنا کلام پیش کیا۔

جلسے کی نظامت نسیم انصاری نے کی۔ اس موقعے پر ساہتیہ اکادمی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر دیویندر دیپک اور اقبال مرکز کے ڈپٹی ڈائرکٹر نے بھی اظہار خیال کیا۔ (ڈاک سے)

اردو میں ووٹر لسٹ اور بیلٹ پیپر شائع نہ کرنے کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ میں رٹ

● الہ آباد، 6 اپریل۔ ''اتر پردیش اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن'' نے الہ آباد ہائی کورٹ کے اس فیصلے کو عدالت عظمیٰ میں چیلنج کیا ہے جس میں عدالت نے کہا ہے کہ فہرست رائے دہندگان، بیلٹ پیپر، پرچۂ نامزدگی، پولنگ مراکز اور امیدواروں کی فہرست اردو میں شائع کیا جانا قانون اردو کے تحت نہیں آتا۔ اتر پردیش اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے قومی صدر محمد اختر چوڑی والا نے ایک بیان میں کہا ہے کہ جسٹس سنیل ہرکولی اور جسٹس وکرم ناتھ کی دو رکنی بنچ نے تنظیم کی تمام درخواستوں کو مسترد کرتے ہوئے صرف محکمہ پنچایت کے 9 قوانین وضوابط کو اردو میں شائع کرنے کی ہدایت دی تھی اور قانون اردو کے ساتوں مقاصد کو نافذ کرانے سے انکار کر دیا تھا۔ لہٰذا ہائی کورٹ کے اس فیصلے کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا گیا ہے کہ قانون اردو کی ساتوں ہدایات پر محکمۂ پنچایت اور محکمۂ بلدیہ میں عمل کیا جائے گا یا نہیں۔ اسی طرح عدالت عالیہ کے اس فیصلے کو بھی عدالت عظمیٰ میں چیلنج کیا گیا ہے جس

میں جسٹس ڈاکٹر بی ایس چوہان اور جسٹس دلیپ گپتا کی دو رکنی بنچ نے اتر پردیش حکومت کی حمایت کرتے ہوئے کہا ہے کہ یو. پی. آفیشیل لینگویج (ترمیم شدہ) ایکٹ 1989 کے تحت راشن کارڈ اور اس کو بنوانے کے لیے درخواست فارم اردو میں شائع کیا جانا لازمی نہیں ہے کیونکہ زیادہ تر اردو پڑھنے اور لکھنے والے لوگ ہندی اچھی طرح جانتے ہیں۔ (ڈاک سے)

آغا حشر کاشمیری کے یوم پیدائش پر جلسہ

● وارانسی، 15 اپریل۔ مشہور ڈراما نویس آغا حشر کاشمیری کے یوم پیدائش کے موقع پر دالمنڈی واقع آغا حشر کاشمیری اکادی کے دفتر ناریل بازار میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں وارانسی کے بم حادثوں کی سخت الفاظ میں مذمت کی گئی۔ بعد ازاں جلسے کی صدارت کرتے ہوئے اکادی کے صدر ڈاکٹر بھانوشنکر مہتا نے کہا کہ ہندی ڈراما میں آغا حشر کو وہ مقام ابھی تک نہیں ملا جس کے وہ مستحق ہیں۔ اکادی کے جنرل سکریٹری آغا نہال نے کہا کہ آغا حشر کے عہد کو پارسی رنگ منچ اور ڈراما ادب کا 'عہد زریں' کہا جانا چاہیے۔ پروفیسر سید حنیف نقوی نے کہا کہ آغا حشر کے ڈراموں میں ہندوستانی تہذیب اور حب الوطنی جیسے موضوعات پر تحقیق کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر یعقوب یاور نے بتایا کہ آغا حشر کے جملہ ڈرامے، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے شائع کیے جارہے ہیں۔ جلسے میں خاص طور سے ڈاکٹر نسیم احمد، ڈاکٹر عبدالسلیم، ڈاکٹر آفتاب احمد، آغا جمال، آغا کمال، اور آغا عمران وغیرہ موجود تھے۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

قاضی عدیل عباسی کی یاد میں خطبہ

● نئی دہلی، 30 اپریل۔ یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا کی جانب سے مجاہد آزادی قاضی عدیل عباسی کی یاد میں تیسرے لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ ساجد میموریل سوسائٹی گورکھپور کے صدر محمد حامد علی خاں نے '' قاضی محمد عدیل عباسی بحیثیت صحافی'' کے عنوان سے لیکچر پیش کیا۔ انھوں نے بتایا کہ جب روزنامہ ''زمیندار'' لاہور کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خاں کو انگریز مخالف تحریروں کے سبب جیل کی سزا ہوئی تو اس وقت انتہائی دلیری کے ساتھ قاضی محمد عدیل عباسی نے ''زمیندار'' کی ادارتی ذمہ داری سنبھالی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ قاضی محمد عدیل عباسی کے اداریوں سے شاعر مشرق علامہ اقبال بے حد متاثر تھے۔ قاضی محمد عدیل عباسی بحیثیت مدیر اخبار ''مدینہ'' بجنور اپنے بے باک، بے خوف اور بے لاگ ہونے کا ثبوت دے چکے تھے۔ ایک مرتبہ پنڈت جواہر لال نہرو ضلع بستی کے سرکاری سفر پر گئے تو اس وقت قاضی صاحب سے خصوصی ملاقات کی اور سرگرم سیاست میں آنے کی دعوت دی مگر قاضی صاحب نے کہا کہ ابھی تو میری زبان اردو جڑ سے کاٹ دی گئی ہے۔ زندگی کے جو لمحات بچے ہیں انھیں میں صرف اردو کو زندگی نو بخشنے میں خرچ کروں گا، چنانچہ دینی تعلیمی کونسل کے قیام کو عمل میں لاکر تا دم حیات اردو کی خدمات میں مصروف رہے۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے کی۔
(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

سید امین اشرف کے اعزاز میں جلسہ

● نئی دہلی۔ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دہلی اردو اکادمی کے اشتراک سے شعبۂ اردو میں ممتاز شاعر سید امین اشرف کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت جامعہ کے سابق وائس چانسلر جناب سید شاہد مہدی نے اور افتتاح جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے کیا۔ حاضرین کا استقبال کرتے ہوئے پروفیسر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے کہا کہ امین اشرف نہ صرف یہ کہ غزل کے اسالیب کی عظیم تاریخ اور ارتقائی خطوط پر گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ صحت مند کلاسیکی شعری اقدار و رسوم کا احترام بھی کرتے ہیں۔ پروگرام کے کنوینر ڈاکٹر خالد محمود نے کہا کہ عشق و محبت اور صوفیانہ روایت کے اتصال سے امین اشرف کی شاعری کا سورج طلوع ہوا ہے۔ جس میں عشق کو جزو اعظم کی حیثیت حاصل ہے۔

اس موقعے پر جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا کہ سید امین اشرف کا کلام ہمارے کلاسیکی ورثے کی بازیافت ہے۔ کلاسیکی شعرا کے بارے میں ذہنی ارتقا کا تصور نہیں تھا۔ وہ ابتدا ہی سے پختگی حاصل کر لیتے تھے اور وہی سطح آخر تک قائم رہتی تھی۔ یہ صفت امین اشرف کی شاعری میں بھی موجود ہے۔ ان کا سارا کلام ایک ہی رنگ و آہنگ اور ایک ہی بلندی کا حامل ہے۔ ان کے عشق میں بھی معشوق کی کیفیت ہے۔ ڈاکٹر سراج اجملی نے امین اشرف کی سوانح اور شاعری کے متعلق مقالہ پڑھا۔ ڈاکٹر احمد محفوظ نے ان کی شاعری پر مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ سید امین اشرف نے فارسی تراکیب کے ذریعے عشق کے داخلی تجربات کو شعری تجربے میں ڈھالا ہے۔ جناب شاہد مہدی نے کہا کہ سید امین اشرف کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ نامساعد حالات میں بھی امید کا دامن نہیں چھوڑتے۔ اس موقعے پر نکہت مقبول مہدی اور ڈاکٹر موصوف احمد نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔ پروفیسر شمیم حنفی، ڈاکٹر کمال احمد صدیقی، پروفیسر رضوان حسین، پروفیسر نقی حسین جعفری، منظور عثمانی، خلیل الرحمٰن دہلوی، خواجہ شاہد، جمیلہ فاروقی، جناب عبدالرشید، ڈاکٹر مولا بخش اور دیگر ادبا، شعرا اور اسکالر تقریب میں موجود تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر خالد محمود نے انجام دیے۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

ایک شام جوگندر پال کے نام

● دربھنگہ، 9 اپریل۔ ادبی والان کی جانب سے "ایک شام جوگندر پال کے نام" کی صدارت للت نارائن متھلا یونیورسٹی کے استاد پروفیسر رئیس انور نے کی۔ اس سے قبل مجیر احمد آزاد نے جوگندر پال کی کہانی "انکار" کا تنقیدی مطالعہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کے بیشتر افسانے بیک وقت دو سطحوں پر چلتے ہیں۔ فیاض احمد وجیہہ نے کہا کہ جوگندر پال کا اپنا مخصوص اسلوب ہے۔ چند افسانے پڑھنے کے بعد ہی ان کے اسلوب سے قاری واقف ہو جاتا ہے۔ پروفیسر رئیس انور نے کہا کہ جوگندر پال ایک سچے فن کار کی طرح انسان کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کو پڑھنے کے بعد ان کے فن سے متعلق ہمارے ذہن میں جو تصور ابھرتا ہے وہ ان کے ناولوں "نادید" اور "بیانات" وغیرہ کو پڑھنے کے بعد مجروح ہونے لگتا ہے۔ ان کے ناولوں میں اس طرح کی اشاریت بھی نہیں ملتی جو ان کے افسانوں کی ایک خاص پہچان ہے۔ ڈاکٹر احتشام الدین نے اس خیال کا اظہار کیا کہ ان کے فن پاروں میں بعض مرتبہ آپ بیتی کا عنصر بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ بحث کے درمیان جناب جمال اویسی نے جوگندر پال کی بعض فنی خامیوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس موقعے پر فیاض احمد وجیہہ نے "دیوی" اور "چاند کی تپش" کے عنوان سے افسانے سنائے۔ (ڈاک سے)

جسٹس وی این کھرے کے اعزاز میں جلسہ

● دہلی۔ گذشتہ دنوں مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی کی جانب سے سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس وی این کھرے کو حکومت ہند کی جانب سے پدم وبھوشن کا اعزاز ملنے پر استقبالیہ تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت خواجہ غریب نواز درگاہ اجمیر کے سجادہ نشیں سید وارث میاں نے کی۔ مہمانان خصوصی تنویر دہلی، آلوک ترویدی ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج نوئیڈا، منصور عثمانی ڈپٹی سکریٹری دہلی سرکار، پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر ایم آر۔ خاں شامل تھے۔ اکیڈمی کے جنرل سکریٹری ایم سلیم نے مہمان اعزازی کا تعارف کرایا۔ گلزار دہلوی اور پروفیسر اختر الواسع نے جسٹس وی این کھرے کے سپریم کورٹ میں دیے گئے تاریخی فیصلوں پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے انھیں مبارکباد پیش کی۔ اکیڈمی کی جانب سے جسٹس کھرے کو ایک شال، گوٹے کا ہار اور اکیڈمی کا مومنٹو پیش کیا گیا۔ استقبالیہ تقریب کے بعد محمد فیاض فاروقی ایس۔ایس۔ پی۔ فرید کوٹ، پنجاب کی صدارت میں مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ مشاعرے میں جن شعرائے کرام نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

گلزار دہلوی، مخمور سعیدی، فصیح اکمل قادری، تنویر دہلی، فیاض فاروقی، شکیل حسن شمسی، رند ساغری، متین امروہوی، طالب رام پوری، شمس رمزی، واجد سحری، شعیب مرزا، انور باری، صالحین فہمی، جاوید مشیری، مخدوم زادہ مختار عثمانی، رؤف رامش اور راجیش شکلا بجن وغیرہ۔ ● (ڈاک سے)

محمد اختر چوڑی والا کو اعزاز

● سلطانپور، 8 اپریل۔ سلطان پور کی ادبی تنظیم بزم ادب کے منعقد کیے ہوئے سالانہ کل ہند مشاعرے میں مہمان اعزازی جناب وبھوتی نرائن رائے (آئی۔جی۔ ریلوے، الہ آباد) نے اتر پردیش اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے قومی صدر محمد اختر چوڑی والا کو اردو کی خدمات کے لیے بطور اعزاز پانچ ہزار روپے مع شال پیش کیے۔ مشاعرے کا افتتاح ڈاکٹر شکیل احمد مرکزی وزیر مملکت برائے مواصلات، حکومت ہند نے کیا اور صدارت معید احمد سابق ریاستی وزیر مملکت برائے آب پاشی نے کی۔

مہمانان گرامی کے سامنے یہ بات رکھی گئی کہ آئین کے مطابق بہار، آندھرا پردیش، اتر پردیش اور دہلی کے مرکزی حکومت کے دفاتر میں (مع بینکوں کے) علاقائی زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کے تعلیم یافتہ ملازم بھی رکھے جانے چاہئیں مگر کسی بھی بینک میں اردو جاننے والے ملازم نہیں رکھے گئے ہیں جس کی وجہ سے کوئی بھی بینک اردو میں پُر کیا ہوا چیک قبول نہیں کرتا ہے۔ اگر اردو داں عوام بیدار ہو جائیں اور ہر شخص اردو میں چیک کاٹنے کے لیے بضد ہو جائے تو حکومت کو بینکوں میں اردو مترجم بحال کرنے پر مجبور ہونا پڑے گا۔

(ڈاک سے)

نشست بہر شناسائی

● بھوپال، 25 مارچ۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی علاقائی شاخ کی جانب سے ایک "نشست بہر شناسائی" کا انعقاد کیا گیا جس میں برکت اللہ یونیورسٹی اور بھوپال کے مختلف کالجوں، مدارس اور ہائر سکنڈری اسکولوں کے اساتذہ اور دیگر معزز ہستیوں نے شرکت کی۔ نشست کی صدارت مشہور وکیل جناب نسیم احمد انصاری نے کی اور نظامت جناب اقبال مسعود نے کی۔ نشست کے آغاز میں علاقائی شاخ کے ریجنل ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد احسن نے یونیورسٹی کا مکمل تعارف پیش کرتے ہوئے بتایا کہ یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر پروفیسر شمیم جیراجپوری نے جہاں یونیورسٹی کو مضبوط بنیاد فراہم کی وہیں موجودہ وائس چانسلر پروفیسر اے ایم پٹھان اسے نئی بلندیوں سے ہم کنار کر رہے ہیں۔ فاصلاتی طریقۂ تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے

مزید کہا کہ تعلیم کا یہ طریقہ اردو والوں کے لیے بہت مناسب ہے کیوں کہ اس میں اخراجات معمولی ہیں۔ بہت ہی کم فیس میں کتابیں بھی فراہم کی جاتی ہیں۔ فاصلاتی نظام کے تحت یونیورسٹی ابھی ایم اے اردو، ایم اے تاریخ۔ بی اے، بی کام، بی ایس سی، بی ایڈ، ڈپلوما ان پرائمری ایجوکیشن، ڈپلوما ان ٹیچ انگلش، ان کے علاوہ کچھ ششماہی سرٹیفکیٹ کورس پیش کررہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ابھی بھوپال ریجنل سینٹر کے زیرِ نگرانی بلاس پور، برہان پور، اندور، بھوپال میں اسٹڈی سینٹر اور راجیو گاندھی کالج آف ایجوکیشن، بھوپال میں بی ایڈ پروگرام سینٹر کام کررہا ہے۔ اس سال جبل پور، شیو پوری، ریوا، چھندواڑہ، ساگر، اجین اور رائے پور وغیرہ میں اسٹڈی سینٹر قائم کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ پرانے شہر بھوپال میں بھی ایک سینٹر قائم کیا جائے گا۔ بعد ازاں شرکا نے اپنے مشورے پیش کیے جن میں حاجی ہارون ایڈووکیٹ، پروفیسر حیدر عباس رضوی، پروفیسر ضمیر الدین، رباب فاطمہ زیدی، ڈاکٹر ارجمند بانو، پروفیسر اظہر راہی، عمر انصاری، مولانا عبدالسبحان ندوی، ڈاکٹر جلیل الرحمٰن اور شمس الرحمٰن علوی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ اس موقعے پر اردو ایکشن کے ایڈیٹر جناب ماجد امتیاز بھی موجود تھے۔ جناب نسیم احمد انصاری نے کہا کہ ریجنل سینٹر کو چاہیے کہ اشتہارات کے ذریعے لوگوں میں اپنے کورسوں سے متعلق واقفیت فراہم کرے۔ نشست کے اختتام پر اسسٹنٹ ریجنل ڈائرکٹر ڈاکٹر عمر فاروق نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

جلسہ ''دورِ جدید میں اردو صحافت کی ذمہ داریاں''

● بارہ بنکی۔ رابطہ سیوا سنستھان کی طرف سے یوم صحافت کے موقعے پر منعقدہ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے منشی رگھونندن پرساد پٹیل بالیکا ڈگری کالج کی شعبۂ اردو کی صدر پروفیسر صلعتن زہرا نے کی۔ ''دورِ جدید میں اردو صحافت کی ذمہ داریاں'' کے موضوع پر بارہ بنکی پترکار ایسوی ایشن کے جنرل سکریٹری محمد طارق خاں نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ تحریک آزادی میں اردو صحافیوں نے اپنے قلم سے قوم کی رہنمائی کی تھی۔ آج پھر اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی قوم کو صحیح راہ دکھائیں جو اکثر جذبات میں آکر اپنے فیصلے کرتی ہے۔ صحافی ایم آئی نادم بارہ بنکوی نے کہا کہ سماج کی برائیوں کو ختم کرنے اور جہیز جیسی لعنت پر قابو پانے کے لیے اردو اخبارات کو مشن کے طور پر کام کرنا ہوگا۔ ادارے کے صدر اور سینئر صحافی محمد سلیم نے پریس کی آزادی کو محدود دائرے میں رکھنے اور مغربی میڈیا میں آزادی کے نام پر شفافیت کی ساری حدیں پار کرجانے کو سماج اور مذہب کے لیے نقصان دہ قرار دیا۔

(قومی آواز، نئی دہلی)

ادبی جلسہ

● جبل پور۔ انجمن ترقی اردو، جبل پور کی جانب سے مدھیہ پردیش اردو اکادمی کے تعاون سے ڈاکٹر پریم چند سریواستو مظہر اور پروفیسر پنا لال سریواستو نور کی شخصیت اور فن پر ایک سیمینار کا انعقاد گورنمنٹ مان کنور بائی گرلس کالج میں کیا گیا جس میں ڈاکٹر محمود شیخ، ڈاکٹر اشفاق عارف، ڈاکٹر نجم النسا اور ڈاکٹر آشوتوش سریواستو نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر ضمیر احمد خاں کی کتاب ''مرزا مشرف یار خاں: شخصیت اور فن'' کا اجرا پروفیسر آفاق احمد اور ظہور منصوری نگاہ کی رباعیات کا مجموعہ ''گلابوں کے چراغ'' کی رسم اجرا سردار مشتاق سنگھ نے انجام دی۔ اس موقعے پر ایک مشاعرہ بھی خالد حسین خاں کی صدارت میں منعقد ہوا۔ کالج کی پرنسپل ڈاکٹر نشا تیواری نے مشاعرے کا آغاز کیا۔ پروفیسر آفاق احمد، سردار مشتاق سنگھ (لندن) مقبول ستنوی، جناب صغیر ریاض، شبنم غضنفری، سید حنان تبسم، پروفیسر پروین حق، زاہدہ تقدیس فردوسی، تلک راج پارس، طارق نظامی اور غیاث جبل پوری شریک محفل ہوئے۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر اشفاق عارف نے کی اور پروفیسر عبدالباقی نے شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کا جلسہ

● نئی دہلی، 26 اپریل۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن (دہلی) کا ایک جلسہ جامعہ نگر میں اردو کے فروغ اور اردو کو عملی طور پر سرکاری دفاتر میں نافذ کرانے کے سلسلے میں منعقد ہوا جس کی صدارت حکیم محمد طارق نے کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کا مسئلہ محض اپیل کرنے اور جلسوں کے انعقاد سے حل نہیں ہوگا بلکہ اس کے لیے سخت قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے کاز کے لیے سرگرم تمام تنظیموں کے اشتراک سے مختلف مقامات پر پرامن احتجاج کیے جائیں۔ اس موقعے پر اتفاق رائے سے درج ذیل قراردادیں منظور کی گئیں۔

1. دہلی سرکار کے مختلف محکموں میں برسوں سے خالی اسامیوں کو پر کیا جائے۔
2. حسب ضرورت مختلف محکموں/مقامی اداروں جیسے جل بورڈ، ڈی ٹی سی، ایم سی ڈی، ڈی ایم سی وغیرہ میں ہندی کی طرح اردو افسروں کا تقرر کیا جائے
3. دہلی سرکار کے اسکولوں میں خالی اردو اساتذہ کی اسامیوں پر بحالی اور ضرورت کے مطابق اردو علاقوں میں اسکول اور اردو شعبے قائم کیے جائیں۔

4. دہلی سرکار کے امداد یافتہ اسکولوں میں اردو اسامیوں کی توسیع اور اردو کی بند یونٹوں کی دوبارہ شروعات کی جائے۔ (قومی آواز، نئی دہلی)

کیریئر گائڈنس پروگرام

● بھیونڈی، 23 اپریل۔ بزمِ علم و ادب کی جانب سے غلام محمد ویمنز کالج میں اردو ذریعۂ تعلیم کے دسویں اور بارھویں جماعت کے طلبہ و طالبات کی رہنمائی کے لیے 'راہیں بند نہیں' کے زیرِ عنوان کیریئر گائڈنس پروگرام منعقد ہوا۔ صدر جلسہ اسلم فقیہ (صدر کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی) نے اس موقعے پر طلبہ کی پیشہ ورانہ تربیت کی ضرورت پر زور دیا۔ انھوں نے رئیس کالج کے استاد ضیاء الرحمٰن کی تصنیف "کتاب کیمیا" کا اجرا بھی کیا۔ تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر مصدق پٹیل (سکریٹری کوکن مسلم ایجوکیشن سوسائٹی) نے معروف کیریئر کونسلر اسد اللہ خاں کی کتاب "کیریئر ڈائرکٹری" کی رسم اجرا ادا کی۔

کیریئر کونسلر شکیل شیخ نے کہا کہ منصوبہ بندی، ذاتی محنت، اور اپنے احتساب کے ذریعے ہی طلبہ کے لیے راہیں کھل سکتی ہیں۔ عبد اللہ خاں نے کہا کہ ہمارے طلبہ مقابلہ جاتی امتحانات میں بہت کم شریک ہوتے ہیں اور شرکت کرنے والوں کے نتائج بھی خاطر خواہ نہیں ہوتے۔ اس کی وجہ ہمارے یہاں تعلیم کے حصول میں سہل پسندی اور نصابی کتابوں کو بھی اہمیت نہ دینا ہے۔ مقابلہ جاتی امتحانات کے سوالات صرف نصابی کتابوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس لیے طلبہ کو ان کا خوب مطالعہ کرنا چاہیے۔

عامر انصاری نے "مشکلات سے دو چار طلبہ کیا کریں؟" کے عنوان سے بولتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ خود اعتمادی، اپنی قابلیت کا عمدہ اظہار اور ماحول سے مطابقت کے ذریعے ہی طلبہ آسانی سے کامیابی پا سکتے ہیں۔ اسد اللہ خاں نے مالی دشواریوں کے شکار طلبہ کو بتایا کہ اسکالر شپ اور تعلیمی امداد کہاں سے اور کیسے حاصل کی جا سکتی ہے۔ ایس پی پاٹل، مشتاق اور حفیظ شیخ نے بھی جلسے میں اظہار خیال کیا۔ ابتدا میں ضیاء الرحمٰن انصاری نے خیر مقدمی تقریر کی اور بزم کے صدر رفیع انصاری نے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ عامر صدیقی اور ساجد انصاری نے جلسے کی نظامت کی اور بزم کے سکریٹری عبد العزیز انصاری نے شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

جلسۂ تقسیم اسناد

● کٹیہار، 19 فروری۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے توحید انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹکنالوجی، ملت نگر، کٹیہار میں سال 2004-05 کے ایک سالہ ڈپلوما ان کمپیوٹر ایپلی کیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی کورس کے 51 طلبہ و طالبات کو ایک جلسے میں اسناد پیش کی گئیں۔

تقریب کی صدارت ڈاکٹر ناصر رضا خاں جلالی سابق صدر شعبۂ اردو ڈی ایس کالج، کٹیہار نے کی۔ مہمان خصوصی ضلع پریشد کے چیئر مین ذاکر حسین اور مہمان اعزازی کے طور پر ضلع این آئی سی کٹیہار کے ڈائرکٹر اوپندر پرساد یادو، بی این منڈل یونیورسٹی این ایس ایس کورڈینیٹر ڈاکٹر عبد اللطیف اور شعبۂ اردو ڈی ایس کالج کٹیہار کے ڈاکٹر انور ایرج اور پروفیسر ایس این پوڈار موجود تھے۔

اس موقعے پر مقررین نے قومی اردو کونسل کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا اور کمپیوٹر اور انفارمیشن ٹکنالوجی کی اہمیت و افادیت پر بھر پور روشنی ڈالی اور اساتذۂ کرام مہتاب احمد، جے پرکاش شرما، مہدی حسن غزالی اور سینٹر انچارج افتخار عالم کے علاوہ سینٹر کے نگراں ڈاکٹر انور ایرج کی محنت کو سراہا۔ تقریب کی نظامت انوار الحق اور شکریہ کے فرائض سینٹر انسٹرکٹر مہدی حسن غزالی نے انجام دیے۔ (ڈاک سے)

مختصرات

● اردو افسانے کے فروغ کے لیے کام کرنے والی انجمن افسانہ کلب مالیر کوٹلہ کی میٹنگ میں 2006-07 کے لیے مندرجۂ ذیل عہدیداران منتخب ہوئے۔

سر پرست: شرون کمار ورما اور ڈاکٹر غضنفر علی (پرنسپل ناردرن لینگویج سینٹر (پٹیالہ)

صلاح کار: پروفیسر محمود عالم (شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج، مالیر کوٹلہ)

صدر: محمد بشیر مالیر کوٹلوی

نائب صدر: اسحاق احمد، سینیر نائب صدر: محمد ناصر آزاد

خازن: رشید عباس

جنرل سکریٹری: سالک جمیل براڑ

پروگرام آرگنائزر: امتیاز ساحل، انیس قریشی

ان کے علاوہ ڈاکٹر ایوب خاں، شفیق خاں، کاشف جاگیردار، محمد آصف اشرف، محمد جمیل اور علی ارشد کو بطور ممبر شامل کیا گیا۔ مالیر کوٹلہ میں پنجاب اردو اکیڈمی کا سنگ بنیاد رکھنے پر حکومت پنجاب کا شکریہ ادا کیا گیا۔ (ڈاک سے)

● حیدر آباد۔ ممتاز ادیب ڈاکٹر م. ق. سلیم کی کتاب "دھجیاں" (طنز و مزاح) کو آندھرا پردیش اردو اکادمی حیدر آباد نے سال 2005 کے لیے زمرۂ الف میں انعام اول کا مستحق قرار دیا ہے۔ انھیں نقد انعام اور سند عطا کی گی اس سے قبل ڈاکٹر م. ق. سلیم کو ان کی کتابوں "مطالعہ اور جائزے"، "آسان اردو خط و کتابت"، "زاویہ نگاہ" پر بھی اردو اکادمی آندھرا پردیش سے انعامات مل چکے ہیں۔ اس کے علاوہ مغربی بنگال اردو اکادمی، بنگلور، دہلی، بہار اور یو پی کے انعامات و اعزازات بھی حاصل ہو چکے ہیں۔ (ڈاک سے)

● کوٹہ، یکم اپریل۔ ملت ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیر سوسائٹی کی جانب سے دارالعلوم رضائے مصطفےٰ وگیان نگر کوٹہ (راجستھان) میں یوم اردو منایا گیا۔ صدارتی خطبے میں مفتی شمیم اشرف نے راجستھان حکومت سے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ کیا۔ جلسے کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر کلیم اشرف ڈائرکٹر مفتی اختر حسین اردو کالج کوٹہ نے کہا کہ اردو کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم دلائیں، خطوط پر اردو میں پتہ لکھیں، اردو میں خط و کتابت کریں، اپنی دوکان وغیرہ کے سائن بورڈ پر ہندی انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی نام پتہ لکھوائیں اور اپنے دوست احباب کو اردو رسالے تحفے کے طور پر بھیجیں۔ ان کوششوں سے اردو زبان زندہ رہ سکتی ہے۔ (ڈاک سے)

مشاعرے

● لندن، 11 اپریل۔ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے ڈائرکٹر جناب شاہد ماہلی کی اردو اکادمی لندن اور ہیرو کونسل کی دعوت پر لندن تشریف آوری کے موقعے پر والتھم سٹولندن 17 ویلکم سینٹر میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا جس میں مقامی اکابرین، کونسلر، وکلا، ماہرین تعلیم، معروف شعرا اور ادبا نے شرکت کی۔

ابتدا میں امیر خسرو سوسائٹی لندن کے بانی صدر جناب ریاض جعفری نے مہمانوں کا تعارف کراتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا کہ شاعر، ادیب اور دانشور کسی ایک قوم، علاقے یا خطّے کا ورثہ اور جائیداد نہیں ہوتے یہ لوگ پوری دنیا کے نمائندے اور ملکیت ہوتے ہیں۔ تمام اہل قلم کا اخلاقی فرض ہے کہ اپنی تحریروں اور معروضات کے ذریعے نہ صرف ہند و پاک بلکہ یہاں دیارِ غیر میں بھی آپس میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کی کوشش کریں اور نسلی تعصب و فرقہ وارانہ فسادات کے خلاف لڑتے رہیں تاکہ ہندوستان اور پاکستان میں باہمی افہام و تفہیم میں اضافہ ہو۔

بعد ازاں جناب شاہد ماہلی اور محترمہ سیما جبار کو امیر خسرو سوسائٹی لندن کی جانب سے امیر خسرو ایوارڈ 2006 پیش کیا گیا۔ اس کے بعد مشاعرے کا آغاز ہوا جس کی صدارت جناب شاہد ماہلی نے کی اور مہمانان خصوصی ڈاکٹر اقبال مرزا، راجا اختر اور ناصر الدین محمود تھے۔ نظامت کے فرائض جناب ایوب اولیا نے ادا کیے۔ مشاعرے میں جن شعرا نے اپنے کلام سے نوازا ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

نعیم سلہریا، ہارون الرشید، صوفی بشیر اعوان، فضل کریم مغل، ڈاکٹر نوید حسن، ڈاکٹر مشہود الحسن، عابدہ اقبال، محمد رفیق، اشفاق حسین اشفاق، ڈاکٹر رحیم اللہ شاد، نجمہ شاہین، شاہین اختر، راجا الیاس، سیما جبار، یوسف عاجز، ناصر الدین محمود، بابر علی، اسلم راجا، عاصم محمود، امجد مرزا امجد، ایوب اولیا، ڈاکٹر اقبال مرزا، ریاض جعفری اور شاہد ماہلی۔ آخر میں ریاض جعفری نے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

● نئی دہلی، 17 اپریل۔ کئی دہائیوں تک دہلی کی ادبی و تہذیبی تاریخ کا اہم حصہ رہ چکا 'بزم شنکر و شاد' کا 43 واں ہند و پاک مشاعرہ جو ڈی سی ایم کے مشاعرے کے طور پر مشہور ہے، دس سال کے تعطل کے بعد ایک بار پھر ماڈرن اسکول میں منعقد ہوا۔ مشاعرے میں ہند و پاک کے مشہور و معروف شعرا موجود تھے۔ مشاعرے کی صدارت وزیر اعلیٰ محترمہ شیلا دکشت نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر نئی دہلی میں پاکستان کے ہائی کمشنر عزیز احمد خاں موجود تھے۔ نظامت کے فرائض ملک زادہ منظور احمد نے انجام دیے۔ مشاعرے میں احمد فراز، بیکل اتساہی، ندا فاضلی، شہریار، جاوید اختر، وسیم بریلوی، ملک زادہ منظور احمد، سرمد صہبائی، ساغر خیامی، راحت اندوری، شین کاف نظام، فاطمہ حسن، معراج فیض آبادی، منور رانا، اقبال اشہر، نسیم نکہت، چرن سنگھ بشر، اشوک ساحل، منظر بھوپالی اور اعجاز پاپولر نے اپنے کلام سے نوازا۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

رسم اجرا

اسباق سلور جبلی نمبر

● پونہ، 23 اپریل۔ اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ پونہ کی جانب سے رسالہ ''اسباق'' کے سلور جبلی نمبر نیز نذیر فتحپوری کی پانچ کتابوں کے اجرا کے سلسلے میں ایک جلسے کا انعقاد اسمبلی ہال میں عمل میں آیا جس کی صدارت جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے کی جب کہ منفرد لب و لہجے کے شاعر مظفر حنفی مہمان خصوصی تھے۔ اعزازی مہمانوں میں ممتاز راشد، محبوب راہی، عبدالاحد ساز، قاضی مشتاق احمد اور قاسم امام شریک محفل رہے جب کہ میزبانوں کی حیثیت سے چیئرمین اعظم ٹرسٹ منور پیر بھائی، محترمہ منور پیر بھائی اور محترمہ عابدہ انعامدار نے شرکت کی۔ سب سے پہلے نذیر فتحپوری کی کتاب ''شعرائے پونہ ایک تحقیق'' کا اجرا شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے ہاتھوں جب کہ ''اسباق'' سلور جبلی نمبر کا اجرا مظفر حنفی صاحب کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس کے ساتھ ہی رفیق جعفر کی مرتبہ کتاب ''نذیر فتح پوری، شخص، شاعر اور مدیر'' کا اجرا چیئرمین اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ پونہ نے جبکہ موصوف کی تین کتابوں ''میرے گیت اکیلے رہ گئے'' (گیتوں کا مجموعہ) ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ (سوانح) نیز منی افسانوں کے مجموعے ''ریزہ ریزہ دل'' (مرتبہ عظیم راہی) کا اجرا محترمہ عابدہ انعامدار صدر دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ نے کیا۔ جناب مظفر حنفی نے اپنی تقریر میں ''اسباق'' کی خدمات نیز پونہ میں حسرت موہانی کے ایروڈا جیل کے چند

تاریخی حقائق کا انکشاف کیا جب کہ جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے پونہ کے پیشواؤں اور دلی کے مسلم حکمرانوں کے اشتراک عمل کو انگریزوں کی پیش قدمی روکنے کا سبب بتا کر پونہ کی تاریخ کے چند ابواب پر روشنی ڈالی۔ آخر میں محترمہ عابدہ انعامدار نے شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

تحریک آزادی کے نمائندہ مسلم مجاہدین

● مولانا رابع حسنی ندوی صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے ڈاکٹر مختار احمد مکی کی تصنیف ''تحریک آزادی کے نمائندہ مسلم مجاہدین'' کا اجرا کرتے ہوئے اسے قابل قدر تصنیف قرار دیا۔ڈاکٹر مختار احمد مکی کریم سیٹی کالج کے شعبۂ سیاسیات میں ریڈر ہیں۔ اس سے قبل ان کی دو کتابیں ''تحریک آزادی اور ہندوستانی مسلمان'' اور ''علامہ اقبال — چند جہتیں'' شائع ہو چکی ہیں۔'' تحریک آزادی اور ہندوستانی مسلمان' کے تیسرے اضافہ شدہ ایڈیشن کا مولانا موصوف نے پیش لفظ بھی تحریر کیا ہے۔

'' تحریک آزادی کے نمائندہ مسلم مجاہدین'' ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہے جس میں تحریک آزادی سے وابستہ ایک سو ایک عظیم مسلم مجاہدین کا سوانحی خاکہ،تحریک آزادی میں ان کی گراں قدر قربانیاں اور ان کے سیاسی افکار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر ہاشم قدوائی نے تحریر کیا ہے۔کتاب الریحان پبلشنگ ہاؤس جمشید پور کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔ یہ قاضی پبلشرز نئی دہلی اور نیو کریسنٹ پبلشنگ ہاؤس، بلیماران، دہلی سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ (ڈاک سے)

آج کی سائنس، مشعل راہ

● نئی دہلی، 6 مئی۔ ''یہ ایک افسوسناک پہلو ہے کہ سائنس کے لوگ اردو سے ناواقف ہیں اور اردو والے سائنس سے دور ہیں۔ سائنس آج کے دور کی ضرورت ہے اس لیے اسے بارھویں جماعت تک لازمی قرار دے دیا جائے۔'' ان خیالات کا اظہار اردو اکادمی دہلی کے دفتر میں اظہار اثر کی تصنیف ''آج کی سائنس'' اور شکیل حسن شمسی کی مرتب کردہ کتاب ''مشعل راہ'' کی رسم اجرا کے موقع پر پروفیسر شاہد مہدی نے کیا۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر اقبال احمد (جامعہ ہمدرد، نئی دہلی) نے کی جب کہ مہمان خصوصی کے طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی نے شرکت کی۔انھوں نے ہی دونوں کتابوں کا اجرا بھی کیا۔ نظامت انیس احمد اعظمی نے کی اور سکریٹری مرغوب حیدر عابدی نے اظہار تشکر کیا۔ پروفیسر اقبال احمد نے کہا کہ سائنس کے بغیر زندگی ادھوری ہے۔ اگر آج کے دور میں ترقی کرنی ہے تو سائنس کے تئیں رجحان پیدا کرنا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ یہ بات اطمینان بخش ہے کہ اب اردو میں شاعری اور افسانوں کے ساتھ سائنس اور صحافت جیسے موضوعات بھی دیکھنے کو مل رہے ہیں۔

شکیل حسن شمسی کی تصنیف ''مشعل راہ'' پر تبصرہ کرتے ہوئے سید شاہد مہدی نے کہا کہ طلبہ کے لیے کیریئر گائڈ کی اشاعت ایک اچھا قدم ہے لیکن اسے صرف دہلی تک ہی محدود نہ رکھا جائے۔ ایسی کتابیں ملک کے دوسرے حصوں کے اردو طلبہ کے لیے بھی شائع ہونی چاہئیں۔ جلسے میں شریف احسن نقوی، اظہار اثر اور شکیل حسن شمسی نے بھی اظہار خیال کیا۔اس موقعے پر لوگوں سے اپیل کی گئی کہ وہ اردو کی تعلیم میں آنے والی رکاوٹوں اور ان کی نظر میں اس کا جو ممکنہ حل ہو تحریری شکل میں اردو اکادمی کو بھیجیں۔

(راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

جدید نظم — حالی سے میراجی تک

● نئی دہلی، یکم مئی۔کوثر مظہری کی کتاب ''جدید نظم — حالی سے میراجی تک'' اردو میں باضابطہ ثقافتی تنقید کے نمونے کے طور پر اور موجودہ دور کی اہم بحثوں مثلاً ثقافتی مادیت اور نو تاریخیت کے حوالے سے حالی سے میراجی تک کی نظموں کی قرأت اور تجزیے کی قابل قدر کوشش ہے۔ ان خیالات کا اظہار اردو سوسائٹی، دیال سنگھ کالج کی جانب سے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ اردو کے استاد کوثر مظہری کی کتاب ''جدید نظم — حالی سے میراجی تک'' (تہذیبی تناظر میں منتخب نظموں کا تجزیہ) کے اجرا کے موقعے پر مولا بخش اسیر نے کیا۔اس موقعے پر پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ اردو میں کسی بھی موضوع پر مبسوط کتابیں کم لکھی جاتی ہیں۔نظموں کا بطور خاص تہذیبی تجزیہ اس کتاب کو اب تک لکھی گئی کتابوں میں منفرد بناتا ہے۔ پروفیسر عتیق اللہ اور ڈاکٹر خالد محمود نے کتاب کے اجرا کی رسم ادا کی۔ خالد جاوید نے اپنے مقالے میں کہا کہ کوثر مظہری نے نظم کے بیچ کو گرفت میں لینے کی کوشش کی ہے۔ اس موقعے پر شعیب رضا وارثی،عبید الرحمٰن،مشتاق صدف، اشہر ہاشمی،شہزاد انجم،ندیم احمد، شیخ عقیل احمد،محمد علیم، ساجد حسین اور ریاض احمد نے بھی اظہار خیال کیا۔ نظامت عمیر منظر نے کی۔ (ڈاک سے)

تاثرات

● گلبرگہ، 27 اپریل۔ممتاز صحافی اور ناقد جناب فضیل جعفری نے انجمن ترقی اردو گلبرگہ کی جانب سے منعقدہ جلسے میں خلیل مامون کی تازہ تصنیف ''تاثرات'' کی رسم اجرا انجام دی۔ خلیل مامون نے اس موقعے پر کہا کہ ان کے مضامین انفرادی نوعیت کے ہیں اور وہ بندھے ٹکے تبصروں سے مختلف ہیں۔ انھوں نے کہا کہ تقریظ نگاری میں بھی صرف محاسن کا اظہار کافی نہیں ہے بلکہ معائب کی صراحت بھی ضروری ہے۔

خواجہ پاشاہ انعامدار (معتمد انجمن) نے جلسے کی غرض وغایت پر روشنی ڈالی اور صدر انجمن شریف احمد قریشی نے استقبالیہ خطبہ پیش کیا۔اس موقعے پر

وہاب عندلیب، ڈاکٹر اکرام بیگ، محترمہ شائستہ یوسف، پروفیسر حمید سہروردی اور عزیز اللہ بیگ نے اظہار خیال کیا۔ جلسے کی نظامت ولی احمد نائب صدر انجمن نے کی۔ سید رؤف قادری صدر آل انڈیا اردو منچ نے شکریہ ادا کیا۔
(ڈاک سے)

اندرا گاندھی — ایک شخصیت ہزار رنگ

● ممبئی۔ ہندوستانی پرچار سبھا اور ممبئی امن کمیٹی کی جانب سے مہاتما گاندھی میموریل لائبریری میں دور درشن کے سابق ڈائرکٹر اور مشہور ادیب فیاض رفعت کی نئی کتاب ''اندرا گاندھی — ایک شخصیت ہزار رنگ'' کی رسم رونمائی ہندوستانی پرچار سبھا کے کارگزار صدر ڈاکٹر محمد اسحاق جمخانہ والا کے ہاتھوں ہوئی۔ اس موقعے پر انھوں نے کہا کہ اندرا گاندھی ہمہ جہت خوبیوں کی مالک تھیں۔ وہ بیک وقت نہ صرف ہندوستان کی سب سے کامیاب وزیر اعظم تھیں، بلکہ ایک قابل اور مستقبل شناس خاتون تھیں۔

صحافی اور افسانہ نگار محمود ایوبی نے اپنے مزاحیہ مضمون میں فیاض رفعت کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی۔ نغمہ نگار حسن کمال نے کہا کہ اندرا گاندھی بہت متنازعہ اور تاریخ ساز شخصیت کی حامل تھیں۔ اس موقعے پر جلیس شیروانی اور ڈاکٹر آدم شیخ نے بھی اظہار خیال کیا۔ عبدالاحد ساز نے اس جلسے کی نظامت کی۔ فیاض رفعت نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں نے شریمتی گاندھی پر یہ کتاب کسی آئیڈیالوجی کو مشتہر کرنے کے لیے ترتیب نہیں دی، بلکہ اردو ادیبوں اور شاعروں سے ان کی والہانہ قربت کو مد نظر رکھتے ہوئے مرتب کی ہے۔ اس پروگرام میں ہندوستانی پرچار سبھا کی روح رواں ڈاکٹر شیلا گپتا، مختار احسن انصاری، کلیم محمود دریابادی، ممبئی امن کمیٹی کے صدر فرید شیخ، ابراہیم اشک، ٹائمس آف انڈیا کے فیچر رائٹر محمد وجیہہ الدین، فرحان حنیف، پروفیسر سعید خاں، طاہر اشرفی، ہندی ہفت روزہ ''ترچھی آنکھ'' کے مدیر مشرف شمسی اور فاروق بریلوی موجود تھے۔ آخر میں ریسرچ آفیسر محمد حسین پرکار نے شکریہ ادا کیا۔
(ڈاک سے)

ابراہیم جلیس — فن اور شخصیت

● شکاگو۔ برصغیر کے ممتاز طنز نگار ابراہیم جلیس کے فن اور شخصیت کے بارے میں بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے اردو استاد ڈاکٹر امتیاز بلوچ کا تحقیقی مقالہ ''ابراہیم جلیس، فن اور شخصیت'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ ابراہیم جلیس نے، جن کا تعلق حیدرآباد دکن سے رہا ہے، 1938 میں گلبرگہ سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''زرد چہرے'' 1945 میں شائع ہوا تھا۔ 1948 میں وہ حیدرآباد سے پاکستان منتقل ہوتے، جہاں انھوں نے اپنا مشہور رپورتاژ ''دو ملک ایک کہانی'' لکھا۔ پاکستان میں ان کی دو درجن سے زائد تصانیف شائع ہوئیں۔ افسانہ نگار، طنز نگار، کالم نگار اور ڈراما نگار کی حیثیت سے انھوں نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ پاکستان کے کئی مشہور اخبارات (بشمول روزنامہ ''جنگ'') میں انھوں نے طنزیہ کالم لکھے اور دنیا کے کئی ممالک کی سیاحت کی۔ اکتوبر 1977 میں 53 برس کی عمر میں ان کا انتقال کراچی میں ہوا۔ ابراہیم جلیس کے بارے میں 351 صفحات پر مشتمل یہ ضخیم کتاب ڈاکٹر امتیاز بلوچ شعبہ اردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان، پاکستان سے حاصل کی جاسکتی ہے۔
(ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد

حفظ الکبیر قریشی

● ٹورنٹو۔ شمالی امریکہ میں اردو کا چراغ روشن کرنے والی اہم شخصیت حفظ الکبیر قریشی کا ٹورنٹو (کینیڈا) میں 12 اکتوبر 2005 کو انتقال ہوگیا۔ موصولہ اطلاع کے مطابق مرحوم کافی دنوں سے علیل تھے لیکن علمی و ادبی مشاغل میں اس حالت میں بھی جہاں تک صحت اجازت دیتی تھی فیض رسانی کا سلسلہ جاری تھا۔ وہ 4 ستمبر 1933 کو امراؤتی میں پیدا ہوئے تھے۔ ناگپور یونیورسٹی سے 1955 میں ایم۔اے کیا۔ لسانیات سے انھیں خصوصی دل چسپی تھی۔ 1960 میں آپ شکاگو (امریکہ) چلے آئے جہاں یونیورسٹی آف شکاگو میں اردو زبان کا درس دیا۔ کبیر صاحب نے ''انتھالوجی آف ماڈرن اردو پوئٹری'' کے نام سے ایک ضخیم اردو کتاب مرتب کی۔ 1965 میں کینیڈا آگئے۔ 1967 میں یہاں پہلا اردو رسالہ ''صہبا'' نکالا۔ یہاں انھوں نے ایک ادبی انجمن بھی قائم کی، جس کی جانب سے 1980 سے بین الاقوامی مشاعروں کا آغاز ہوا۔ ان مشاعروں میں ہندوستان اور پاکستان کے مقتدر شعرا شرکت کرتے رہے۔ کبیر صاحب شاعر بھی تھے۔ وہ ہفتہ وار ''پاکیزہ'' میں ''شاعری کیا ہے'' کے عنوان سے مستقل کالم بھی لکھتے تھے۔ کبیر صاحب کی ان خدمات کی وجہ سے انھیں شمالی امریکہ کے بابائے اردو کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

مصیب الرحمٰن

● نئی دہلی، 5 اپریل۔ مجلس فروغ اردو ادب دوحہ۔ دبئی کے بانی ملک مصیب الرحمٰن کا دو اپریل کی صبح انتقال ہوگیا۔ مرحوم اپنے چچا کی تدفین کے سلسلے میں لاہور آئے تھے۔ وہ پچھلے کئی برسوں سے شوگر، ہائی بلڈ پریشر اور گردوں کے عارضے میں مبتلا تھے۔ گذشتہ دو دہائیوں سے بھی زیادہ عرصہ پہلے دوحہ قطر میں مجلس فروغ اردو ادب کی داغ بیل ڈالی گئی تھی، جس کے زیر اہتمام بے شمار ادبی محفلیں منعقد ہوئیں جن میں جشن محشر، جشن کیفی اعظمی، جشن

پیرزادہ قاسم، جشن علی سردار جعفری، جشن شہزاد، جشن بشیر بدر، جشن امجد اسلام امجد اور جشن جون ایلیا شامل ہیں۔ اس تنظیم کی جانب سے عالمی فروغ اردو ادب ایوارڈ کے اجرا میں بھی مرحوم مصیب الرحمٰن کا تاریخی کردار رہا ہے۔ ایک لاکھ پچاس ہزار روپے نقد، طلائی تمغہ اور سپاس نامہ پر مشتمل قطر کا یہ ایوارڈ ہر سال ایک ہندوستانی اور ایک پاکستانی ادیب کو ان کی علمی و ادبی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں دیا جاتا رہا ہے۔

شاہد کلیم

● آرہ۔ معروف شاعر جناب شاہد کلیم کا 13 اپریل کو انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 55 برس تھی۔ وہ کافی عرصے سے ذیابیطس کے مرض میں مبتلا تھے بعد میں ان کے گردے بھی خراب ہو گئے تھے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عطاء الرحمٰن عطا کی رہائش گاہ واقع ملکی محلہ، ڈابر گلی، آرہ (بہار) میں ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں اردو اور ہندی کے ادیبوں اور شاعروں نے جناب شاہد کلیم کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اور ان کے فکر وفن پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر رحمت علی، ابرار صادق، ڈاکٹر عطاء الرحمٰن عطا، پروفیسر رضوان اللہ آروی، غلام رسول خاں عزم، شمیم یوسفی اور غلام رسول کیفی قابل ذکر ہیں۔ اس جلسے کی صدارت جیتیندر کمار اور تاج پیامی نے کی۔

جلال مرادآبادی

● مرادآباد، 6 اپریل۔ معروف بزرگ شاعر جلال مرادآبادی کا 5 اپریل کو اچانک انتقال ہوگیا۔ جلال مرادآبادی مرادآباد شہر کے محلہ باڑہ شاہ صفا میں پیدا ہوئے۔ ان کے چار مجموعۂ کلام بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ عابد حسین انصاری متخلص جلال مرادآبادی کے پسماندگان میں کوئی نہیں ہے۔ انھوں نے شادی نہیں کی تھی۔ انھیں سرکاری تکیہ میں سپرد خاک کیا گیا۔

جاوید ناصر

● ممبئی، 8 اپریل۔ جدید لب و لہجے کے اہم شاعر جناب جاوید ناصر کے انتقال پر اعتراف گروپ، جریدہ ''نیا ورق'' اور مہاراشٹر اردو رائٹرس گلڈ کی جانب سے میرا روڈ میں رحمان عباس کے مکان پر ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں یعقوب راہی، سلام بن رزاق، انور قمر، عبدالاحد ساز، پروفیسر ظہیر علی، ساجد رشید، فاروق آشنا، وقار قادری، اور رحمان عباس نے مرحوم کے فن اور شخصیت پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر اظہار تعزیت کرتے ہوئے انور قمر نے کہا کہ مرحوم کا تعلق شاعری سے تھا لیکن انھوں نے ریڈیو کے لیے قرۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی، وغیرہ کے جو انٹرویو لیے ان سے ان کی فکشن پر گہری نظر ہونے کا پتہ چلتا تھا۔ عبدالاحد ساز نے کہا کہ جاوید ناصر کے یہاں زندگی کی سوچ اور احساس کے تعلق سے گہرائی تھی۔ سلام بن رزاق نے بتایا کہ میرے ان سے 1977 سے مراسم رہے ہیں۔ مکتبہ جامعہ کی محفلوں میں وہ آیا کرتے تھے۔ انھوں نے جاوید ناصر کی نظم '' بھنور'' پیش کی۔ یعقوب راہی نے کہا کہ جاوید بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ رشید ساجد نے بتایا کہ ان کا تیسرا مجموعہ '' تازیانہ'' بہت جلد ادارہ '' نیا ورق'' کی جانب سے منظر عام پر آ رہا ہے۔ نشست کی صدارت جاوید ناصر کے کالج کے دیرینہ رفیق پروفیسر ظہیر علی نے کی۔ انھوں نے بتایا کہ جاوید ناصر انگریزی میں ایم اے کرنے کے بعد اورنگ آباد (مہاراشٹر) کے ایک مقامی کالج میں انگریزی پڑھانے لگے تھے۔ بعد میں ریڈیو میں آ گئے اور یہیں کے ہو رہے۔ ابھی ان کے سبک دوش ہونے میں چند سال باقی تھے۔ ناسٹلجیا، اورنگ آباد کی زوال آمادہ جاگیردارانہ تہذیب کا اثر اور اس کا نوحہ ان کی شاعری کا حصہ ہیں۔

طیب انصاری

● گلبرگہ، 3 اپریل۔ ممتاز نقاد اور محقق ڈاکٹر محمد طیب انصاری کے سانحۂ ارتحال پر انجمن ترقی اردو ہند شاخ گلبرگہ کا ایک تعزیتی اجلاس صدر انجمن جناب شریف احمد قریشی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں جناب وہاب عندلیب نے کہا کہ 1968 سے وہ طیب صاحب سے واقف تھے، انھوں نے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کے علاوہ سفر نامہ، خاکہ نگاری اور ڈائری بھی لکھی۔

افسانہ نگار انجم باگ نے کہا کہ طیب انصاری طلبہ کی صلاحیتوں کو پہچانتے اور ان کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ محمد مجیب احمد نے کہا کہ وہ اپنے شاگردوں کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے اور زندگی کے مسائل کا مقابلہ کرنے کے لیے انھیں تیار کرتے تھے۔ امجد جاوید (نائب صدر انجمن) نے کہا کہ طیب صاحب کی شخصیت میں مقناطیسیت تھی، وہ سب کو متاثر کرتے تھے۔ ڈاکٹر حمید سہروردی، حامد اکمل، شاہنواز شاہین، حشمت فاتحہ خوانی، ڈاکٹر رفیق رہبر، ولی احمد (نائب صدر انجمن) نے بھی جلسے میں اظہار خیال کیا۔ جناب شریف احمد قریشی نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ طیب انصاری سے 1956 سے میری دوستی رہی ہے۔ وہ ہائی اسکول سے کالج تک کے زمانہ طالب علمی میں تقریری مقابلوں میں ہمیشہ اول آتے تھے۔ ابتدا ہی سے ادب سے انھیں لگاؤ تھا۔ تعلیمی دور میں ہم دونوں کے لیے بڑی آزمائش کا زمانہ تھا، ہمیں خود اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر تعلیم حاصل کرنا تھا۔ گلبرگہ میں انھوں نے حیدرآباد کرناٹک لٹریری ایسوسی ایشن سے لے کر انجمن ترقی پسند مصنفین اور اساتذہ جامعہ گلبرگہ جیسی کئی انجمنیں بنائیں۔ آخر میں خواجہ پاشا انعامدار (معتمد انجمن) نے قرارداد تعزیت پیش کی۔

□□□

تبصرہ و تعارف

حیات سعدی/خواجہ الطاف حسین حالی
صفحات:186، قیمت:-/96روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر. کے. پورم نئی دہلی۔66
مبصر: شہاب ظفر اعظمی، شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ۔5 (بہار)

خواجہ الطاف حسین حالی (1914-1837) نے تین سوانح عمریاں لکھیں، حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید۔ ان میں "حیات سعدی" کو تاریخی اعتبار سے اولیت حاصل ہے جو 1881 میں شائع ہوئی۔ اگر چہ حالی سے قبل اردو میں سوانح نگاری کی طرف ایک قدم مولوی محمد حسین آزاد بڑھا چکے تھے اور "آب حیات" میں تذکروں کے عام انداز سے آگے جا کر مختلف شعرا کی زندگی کے جیتے جاگتے مرقعے پیش کر چکے تھے لیکن "آب حیات" میں تاریخی اور سوانحی حقائق کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ تخیل کی بلند پروازی اور الفاظ کی شعبدہ بازی پر زیادہ انحصار کیا گیا تھا۔ حالی نے "حیات سعدی" میں سوانح نگاری کے اصول و ضوابط کو پیش نظر رکھا ہے۔ اس سے پہلے اردو میں کوئی سوانح عمری اس نہج پر نہیں ملتی۔

کتاب کی ابتدا میں حالی نے "صنف سوانح" کی جامع تعریف کر کے اہل زبان کو "جدید بیوگرافی" سے روشناس کرانے کی سعی کی ہے۔ پھر انھوں نے مشرق کے تصور سوانح نگاری کے بارے میں لکھا ہے اور بتایا ہے کہ ظہور اسلام کے بعد اہل عرب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور حیات اقدس کے واقعات کو مجتمع اور محفوظ کرنے میں کس احتیاط اور تحقیق سے کام لیا ہے، اس کے بعد وہ اپنے اصل موضوع یعنی "جدید بیوگرافی" پر آئے ہیں اور اس کی تعریف اور ضرورت پر زور دیا ہے۔ حالی "بیوگرافی" کو اصلاحی اور اخلاقی مشق کی ایک کڑی سمجھتے ہیں اور اسے ایک افادی صنف ادب سے تعبیر کرتے ہیں۔ انھوں نے ایک انگریز مصنف کا قول نقل کیا ہے کہ

"بیوگرافی چلا چلا کر اور سمندر کے طوفان کی طرح غل مچا کر یہ آواز دیتی ہے کہ جاؤ اور تم بھی ایسے ہی کام کرو"۔

یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے سعدی جیسی شخصیت کا انتخاب کیا جن کی حق گوئی، ہمت اور مستعدی، ایران کے دور تعطل میں ذوق عمل کا جذبہ اور سیر و سیاحت ہر زمانے میں قابل تقلید رہی ہے۔ سعدی اپنے زمانے میں ہی نہیں، ہر زمانے میں ایک منفرد اور ممتاز شخصیت ہیں۔

"حیات سعدی" شیخ سعدی شیرازی کے احوال و کوائف پر مشتمل ہے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں شیخ سعدی کے سوانحی حالات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں مثلاً نام و نسب، ولادت، بچپن، تعلیم، سیاحت اور مختلف اسفار وغیرہ۔ دوسرے حصے میں ان کی تصنیفات نثر و نظم پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ اس میں سعدی کی شاعری سے متعلق دیگر اصحاب قلم کی آرا، کلیات سعدی، گلستاں و بوستاں، قصائد، رباعیات، مفردات، ہزلیات و مضحکات اور عربی قصائد و مقطعات (مع ترجمہ) کے منتخب اشعار جمع کیے گئے ہیں۔ اسی حصے میں حالی نے گلستاں کے ساتھ بہارستان اور خارستان کا موازنہ و مقابلہ کر کے تقابلی تنقید کا عمدہ نمونہ پیش کیا ہے۔ تیسرا حصہ "خاتمہ" ہے جس میں مصنف نے شیخ سعدی کے عام حالات زندگی کی روشنی میں ان کے کلام کو پرکھا اور سراہا ہے۔ اس طرح مولانا حالی نے شیخ سعدی کی زندگی کے مختلف گوشوں اور کارناموں سے قارئین کو متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ اردو زبان کی پہلی کتاب تھی جس میں کسی شاعر کے اپنے مفصل حالات کے علاوہ اس کے کلام پر محققانہ تبصرہ کیا گیا تھا۔

"حیات سعدی" میں حالی کا طرز نگارش سادہ ہے۔ اس میں ایک خاص توازن، نرمی اور ہمدردی پائی جاتی ہے۔ ان کی تحریر کی دردمندی، سلامت روی اور توازن اس بات کے شاہد ہیں کہ حالی کی افتاد طبع سوانح نگاری کے لیے عین مناسب اور موزوں تھی۔ اسی لیے "حیات سعدی" کی حیثیت اردو سوانح نگاری میں بیش قیمت سرمائے کی ہے۔ قومی اردو کونسل نے اسے شائع کر کے ایک اہم اور نایاب کلاسیکی سرمائے کو محفوظ کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے جو قابل تحسین ہے۔

نام کتاب: میر تقی میر
مصنف: نثار احمد فاروقی
صفحات: 194 قیمت: -/38 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی
مبصر: عبدالرب، 252، سابرمتی ہوسٹل، جے این یو نئی دہلی۔ 67

اس کتاب کا پہلا باب میر کی سوانح حیات، دوسرا میر کے فن اور آخری باب انتخاب کلام پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں بقول مصنف ''چند باتوں کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے پہلی بات یہ کہ میر کے مستند حالات زندگی اختصار اور زمانی تسلسل کے ساتھ بیان ہو جائیں۔ غیر ضروری باتوں کو چھوڑ دیا جائے اور کتاب کو طلبہ کے لیے مفید اور معاون بنایا جائے۔'' اس طرح میر کے حالات زندگی اختصار سے اور جامع انداز میں مختلف عنوانات کے تحت بیان کیے گئے ہیں۔ میر کے خاندان تعلیم و تربیت، سماجی ماحول، مختلف اسفار، ملازمت اور ادبی خدمات پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ میر کی تصانیف کا تعارف سادہ، سلیس اور آسان زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ میر کے اردو دواوین کی تعداد، ان میں شامل غزلوں کی تعداد، کلیات میر میں غزل کے علاوہ دیگر اصناف مثلاً مثنویاں، قصائد، مراثی وغیرہ۔ فارسی دیوان، نثری تصانیف تذکرہ نکات الشعرا، ذکر میر، قصہ دریائے عشق کا احاطہ کرتے ہوئے میر کی حیات اور شاعری پر لکھی گئی اہم کتابوں سے متعلق بھی وافر معلومات یکجا کر دی گئی ہیں۔

دوسرے باب میں میر کے کلام کی فنی خصوصیات زیر بحث آئی ہیں۔ میر کی شاعری میں تلاش الفاظ کی اہمیت، شعر کی معنوی فضا کا رکھ رکھاؤ۔ پیرایۂ اظہار کی شائستگی سے میر کے فن میں جو بلندی پیدا ہوئی ہے اس پر ادبی گفتگو کی گئی ہے۔ نثار احمد فاروقی کے بقول ''جتنی رنگا رنگ متحرک اور مختلف جہات والی امیجری ہمیں میر کی شاعری میں ملتی ہے وہ متقدمین و متاخرین شعرا میں سے اور کسی کے یہاں نظر نہیں آتی یہ اس امیجری کے زور قوت کا ادنیٰ سا کرشمہ ہے کہ وہ مجرد اشیا کو بھی آنکھوں سے دکھا سکتا ہے۔''

میر کے مختلف اشعار کی نہایت سادہ اور آسان لفظوں میں تشریح کرتے ہوئے میر کے فن کارانہ کمال کو واضح کیا ہے۔ میر کے کلام میں ایجاز کا اعجاز، سادہ اور عام فہم الفاظ سے اشعار میں جہان معنی کا سمو دینا میر کے کمالات میں سے ہے۔ شخصی کیفیات کا بیان، جذبات نگاری نیز کثیر الاستعمال اور حقیر لفظوں سے اشعار میں غیر معمولی تاثیر پیدا کر دینا میر کا آرٹ ہے۔ ان تمام امور پر میر کے اشعار کی روشنی میں نثار احمد فاروقی نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

آخری باب کلام میر کے انتخاب پر مشتمل ہے یہ انتخاب اتنا عمدہ اور جامع ہے کہ قاری یک نظر میر کے دل کو چھو لینے والے اشعار اور نمائندہ غزلوں کے مطالعے سے میر کے شعری اسلوب کو سمجھ سکتا ہے لیکن غزلوں کے ساتھ دیگر اصناف کا انتخاب بھی شامل ہوتا تو کتاب کی اہمیت دو چند ہو جاتی۔ اس ذیل میں نثار احمد فاروقی کا یہ کہنا بجا ہے کہ ''میر کی کلیات بہت ضخیم ہے چھ دیوانوں سے کتنا ہی مختصر انتخاب کیا جائے وہ ڈیڑھ دو سو صفحات سے کم میں نہیں سما سکتا اس لیے ہم نے صرف دیوان اوّل کی غزلیات کا ایک نمائندہ انتخاب پیش کر دیا ہے۔''

رام پرشاد بسمل کی آپ بیتی
مرتب: ڈاکٹر وشو امتر اپادھیائے
مترجم: احسان احمد صدیقی
صفحات: 109، قیمت: -/33 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، ونگ۔6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
مبصر: عبیدالرحمن، ایم۔2، رنگیلی بلڈنگ، گلی نمبر۔6، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025

رام پرشاد بسمل نے اپنی یہ آپ بیتی گورکھپور جیل میں اپنی پھانسی 19 دسمبر 1927 کے دو دن قبل مکمل کی تھی۔ یہ دراصل تین قسطوں پر مشتمل تھی جسے بسمل صاحب نے گورکھپور کے معروف کانگریسی رہنما دسرتھ پرشاد دویدی کو جیل سے خفیہ طور پر بھجوائی تھی۔ آخری قسط تو پھانسی کے ایک دن پہلے ہی دویدی صاحب کو ملی تھی۔ یہ تاریخی حیثیت کی خود نوشت دویدی صاحب نے گنیش شنکر ودیارتھی کو دی جنھوں نے اسے 'کاکوری کے شہید' نامی کتاب کے ابتدائی صفحات میں شامل کیا تھا۔

رام پرشاد بسمل کے سینے میں جو آگ روشن تھی، اور جو مقصد پیش نظر تھا، ان کی نظیر تاریخ کے اوراق میں خال خال ہی ملتی ہے۔ بسمل نے ظلم و استحصال کے خلاف اپنے قلم کا بھرپور استعمال کیا اور عوام کے دلوں میں موجود بغاوت کی چنگاری کو شعلہ بنا دیا۔

کتاب چار ابواب میں منقسم ہے۔ پہلا باب ذاتی کردار کو محیط ہے جس میں بسمل نے مفلوک الحال خانگی زندگی، نامساعد ایام، ازدواجی زندگی اور ایام جوانی کے دلچسپ و سبق آموز واقعات بیان کیے ہیں ساتھ ہی ساتھ ماں کی شفقت و قربانی، اپنے گرو دیو سوامی سوم دیو جی کی حکایات اور ان کے مذہبی و سیاسی اپدیشوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ باب کے آخر میں تجردانہ زندگی کی پابندی کے تحت نوجوانوں کو اخلاقی تعلیم دی ہے اور روزانہ کے مشاغل کو بہتر بنانے کی

طرف ان کی توجہ مبذول کی ہے۔

بسمل کے اندر حب وطن کے جذبے نے کس طرح سر ابھارا اس کا مفصل بیان دوسرے باب میں ملتا ہے۔ اس میں وطن پرستی اور خدمت خلق کی اہمیت بھی اجاگر ہوتی ہے نیز لکھنؤ کی انقلابی تحریک سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ یہاں بسمل نے اپنی کاروباری زندگی کا بھی نقشہ کھینچا ہے۔

اس کے تحت کئی کتابوں کے ترجمے اور اشاعت پر روشنی ڈالی ہے۔ اسی بیان کو مزید وسعت دیتے ہوئے تیسرے باب ''آزاد زندگی'' میں کتابوں کے کاروبار میں ہوئے نقصان کا بیان ملتا ہے۔ ان دو ابواب کے مطالعے سے قاری رام پرساد بسمل کی تحریروں سے واقف ہو جاتا ہے۔

باب چہارم'' وسیع تنظیم'' کے تحت تحریک عدم تعاون کے دم توڑنے سے متعلق رام پرشاد بسمل نے اپنی بات شروع کی ہے بعد ازاں کارکنوں کی بدحالی، بے چین نوجوانوں کے گروپ، کاکوری ریلوے ڈکیتی، گرفتاری اور جیل کے واقعات قلم بند کیے ہیں۔ اس دوران اپنے ساتھیوں کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ پھانسی کی کوٹھری، انجام اور آخری وقت کی باتیں بڑی دل خراش ہیں۔

اس آپ بیتی کے مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے کہ رام پرشاد بسمل کیسے آہنی ارادوں اور حوصلوں کے مالک تھے۔ یہ خودنوشت ایک ایسی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے جس میں نہ مذہب کے اختلافات ہیں اور نہ اندازِ فکر کے امتیازات، نہ کوئی لسانی تعصب ہے اور نہ علاقائی تنگ نظری۔

ڈاکٹر وشوامتر اپادھیائے نے اس کتاب کو ترتیب دے کر ایک اہم کام انجام دیا ہے احسان احمد صدیقی کا ترجمہ سادہ اور سلیس ہے۔

آپ کی تعریف

مصنف: مجتبیٰ حسین
مرتب: سید امتیاز الدین
ناشر: موڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی۔2
قیمت:۔/300 روپے
مبصر: مصحف اقبال توصیفی
معرفت: 502، مہتا ریجنسی، اے.سی.گارڈس، حیدرآباد۔4

'' آپ کی تعریف''، مجتبیٰ حسین کے شخصی خاکوں کا تازہ انتخاب ہے جو نہ صرف اپنا ایک مخصوص ادبی وقار رکھتا ہے بلکہ زائد از نصف صدی کے ادبی، سماجی اور تہذیبی ورثے کا عکاس بھی ہے۔ سید امتیاز الدین نے یہ کتاب مرتب کر کے مجتبیٰ حسین کے دلدادگان کی تسکین ذوق کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ اس انتخاب میں پچاس (50) سے زائد خاکے ہیں جن شخصیات پر یہ خاکے لکھے گئے ہیں وہ یا تو برصغیر کی ادبی، صحافتی اور ثقافتی تاریخ کا حصہ ہیں یا موجودہ عہد میں اپنے اپنے دائرۂ کار میں جداگانہ شناخت رکھتے ہیں۔ ایک خاکہ اس خاندان کے بارے میں بھی ہے جو لگ بھگ ستر برسوں سے اردو ادب اور صحافت کے گلشن کی آبیاری کر رہا ہے۔ محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس کے بعد اس خاندان کے تیسرے اہم فرد خود مجتبیٰ حسین ہیں۔ یہ انتخاب اس کتاب کے مرتب سید امتیاز الدین کے حسن ذوق اور حسن نظر کا آئینہ دار بھی ہے۔ ابتدائی صفحات میں امتیاز الدین نے ''عرض مرتب'' کے تحت جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے ہمیں مجتبیٰ کے فن کی تحسین میں مدد ملتی ہے۔

مجتبیٰ حسین کے خاکوں میں کئی خوبیاں ہیں۔ واقعہ نگاری ایسی کہ افسانہ لگے۔ افسانہ طرازی ایسی کہ ہم لفظوں کو چھونا چاہیں تو انگلیاں لمس کی حدت سے جل اٹھیں۔ زبان کے کلاسیکی دھنک جیسے رنگوں کے ساتھ عام بول چال کی مٹی کی سوندھی خوشبو، ایک عجیب سی دردمندی، آنسو اور تبسم کے ساحلوں کو چھوتی دکھ کی ایک ایسی لہر جس کی نظارگی انھیں اپنی ذات اور تنہائی کے حصار سے باہر نکلنے پر اکساتی ہو۔ جب وہ اس دکھ کو ایک فلسفیانہ فراخ دلی سے قبول کر لیتے ہیں اور اس میں ایک عام آدمی بلکہ ساری انسانیت کے غموں کا عکس دیکھ لیتے ہیں تو یہ دکھ آسمان پر شفق کے رنگوں میں بکھر جاتا ہے اور ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے یہ سچ ہے کہ وہ ایک بے حد غم زدہ، بے چین، روح کے مالک ہیں اور اس کا اظہار انھوں نے اپنی تحریروں میں کئی جگہ کیا ہے۔

مجتبیٰ حسین اپنے موضوع سے بہت جلد گھل مل جاتے ہیں۔ وہ اس سے اس قدر جلد ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور ایسی یگانگت پیدا کر لیتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ اس قدر طویل فاصلہ —— محسوس اور نامحسوس کے درمیان، زندہ اور بے جان اشیا کے درمیان، یوں پلک جھپکاتے کیسے طے ہو گیا۔ اب اگر موضوع یا مخاطب کوئی شہر، صحرا، سمندر یا بے جان شئے نہ ہو بلکہ کوئی جیتا جاگتا ایسا انسان ہو جس کا دل بھی ان ہی کی طرح دھڑکتا ہو، دماغ ان کی طرح سوچتا ہو یا وہ چند قدم ہی ان کے ساتھ چلنے پر قادر ہو تو یہ ہمرہی ایک ایسے شخصی خاکے میں ڈھل جاتی ہے جس کی مثال ایک ایسے سفر کی ہو جو دل و نگاہ کے لیے فرحت و انبساط کا سامان رکھتا ہو۔ اسی لیے ان کے پیچھے ان کے پڑھنے والوں کا ایک کارواں بھی ان کا ہم سفر ہو جاتا ہے۔

مجتبیٰ حسین نے بزرگ شخصیتوں کے جو خاکے لکھے ہیں وہ عام خاکوں سے ذرا مختلف ہیں۔ ان میں پاس ادب کے ساتھ ساتھ ایک کھلنڈرا پن بھی ہے جیسے شریر بچے اپنے بڑوں کی عزت کرتے ہوں اور ان سے بے تکلف بھی ہوں، جیسے کرشن چندر کے خاکے میں مزاح نگاروں کی کل ہند کانفرنس میں

صدارت کے لیے کرشن چندر کو حمایت اللہ کی موٹر میں بٹھا کر لے جانے کی حکایت دلپذیر۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اس پچاس سال پرانی مزاحیہ موٹر کی خوبی یہ تھی کہ اس کی کوئی چھت نہیں تھی پہیے البتہ تھے، سیٹیں بھی کہیں کہیں تھیں اور کہیں نہیں تھیں' یہ شوخی، یہ پھبتیں، یہ کیفیت ہمیں دوسرے مزاح نگاروں کے ہاں کم بلکہ خال خال ہی نظر آتی ہے۔ اپنے ہم عصر ادیبوں، شاعروں یا احباب پر مجتبیٰ نے جو خاکے لکھے ہیں انھیں پڑھتے ہوئے بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ مجتبیٰ کو اپنے موضوع سے ایک گہرا تعلق خاطر ہے۔ لیکن یہاں وہ ہم نفسی اور ہم نظری کی سطح برقرار رکھتے ہیں۔ اختلاف کا کوئی پہلو نکل بھی آئے تو اپنی فطری رم آمادگی کی خو کا سہارا لیتے ہوئے گفتگو کا رخ کسی اور سمت اس طرح موڑ دیتے ہیں کہ ممدوح کی شخصیت کی حلاوت اور دل آویزی کا کوئی اور پہلو منکشف ہو جائے۔ میں اس کتاب میں شامل خاکوں سے چند اقتباسات پیش کرنا چاہوں گا ورنہ میری تحریر بے کیف رہے گی۔

"باقر مہدی کا سب سے بڑا ہتھیار خود ان کی زبان رہی ہے۔ اب وہ زبان تیز اور طرار جملے ادا کرنے کے قابل نہیں رہ گئی ہے تو یوں لگا جیسے باقر مہدی بالکل نہتے ہو گئے ہوں..." ("باقر مہدی")۔

"... کتاب اتنی دلچسپ تھی کہ رات کا کھانا بھی ہم نے کچھ اس طرح کھایا کہ بائیں ہاتھ میں کتاب رکھی اور دائیں ہاتھ سے کھانا کھاتے رہے... یہ پہلا موقع تھا جب ہم نے اپنی "نصف بہتر" کے پکوان پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری اہلیہ محترمہ نے اس کتاب کو ڈائننگ ٹیبل پر اس جگہ رکھ چھوڑا ہے جہاں اچار ٹماٹر کا ساس، سونف، سرکہ، نمک اور کالی مرچ وغیرہ کی بوتلیں رکھی رہتی ہیں" ("یوسف ناظم")۔

"میں نے کبھی ان کے گھر میں بالعموم اردو اور بالخصوص انگریزی کے سوائے کسی اور زبان کا چلن دیکھا نہ سنا۔ ایک بار میں نے پروفیسر نارنگ کے ٹیلی فون سے اپنے ایک دوست سے مراٹھی زبان میں بات کی تو ان کا فون ہی خراب ہو گیا..." ("گوپی چند نارنگ")۔

کتاب نہایت سلیقے سے چھپی ہے، اور گیٹ اپ دیدہ زیب ہے۔

نام کتاب: گفتگو ان کی
مصنف: ڈاکٹر اطہر فاروقی
صفحات: 300، قیمت: -/150 روپے
ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی
مبصر: قمر رئیس، سی۔166، وویک وہار، فیز۔1، دہلی۔95

"گفتگو ان کی" اطہر فاروقی کے 29 انٹرویوز کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے اکثر ہندوستان اور پاکستان کے مقتدر اخبارات و جرائد میں، اردو اور انگریزی میں شائع ہوئے ہیں اور اپنے موضوع پر حوالہ جاتی اور دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان انٹرویوز کی اشاعت کے بعد کوئی نہ کوئی تنازعہ ضرور ہوا یعنی ان کا غیر معمولی نوٹس لیا گیا۔ اپنے انٹرویو کی اشاعت کے بعد خود مجھے بھی اس کا تجربہ ہوا تھا۔ میرے انٹرویو پر مسلم اساس پرستوں نے سخت ردعمل کا اظہار کیا تھا اور بحث کے آخر میں اطہر فاروقی نے ترقی پسند نظریاتی موقف اختیار کرتے ہوئے میرے معروضات کی حمایت میں کہا کہ وہ جانب دار ہیں اور نظریاتی طور پر ترقی پسند خیالات کے حامی۔

میں اطہر فاروقی کو کوئی بائیس تئیس برسوں سے جانتا ہوں۔ جب ان سے پہلی ملاقات ہوئی، اس وقت وہ غالباً انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے اور اپنے وطن سکندرآباد ضلع بلند شہر میں بائیں بازو کے نظریات کے حامی ہو چکے تھے۔ کمیونسٹ پارٹی جوائن کر لی تھی اور زندگی کے ہر شعبے میں چوں کہ ترقی پسند نظریات کی مکمل اجارہ داری چاہتے تھے اس لیے سکندرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ کے قیام کے بھی خواہاں تھے۔ اسی سلسلے میں میرے پاس آئے تھے۔ سکندرآباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین قائم ہوئی اور خوب چلی۔ ایک دفعہ ایک بڑے جلسے میں بہت سے ترقی پسند ادیب، شاعر وہاں گئے۔ چھوٹی جگہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا وہ بڑا کامیاب جلسہ، بڑے سلیقے اور بہت اعلیٰ انداز میں کیا گیا۔ بعد میں اطہر فاروقی دہلی آ گئے اور میری نگرانی میں "ترقی پسند تحریک کی فلسفیانہ اساس" پر دہلی یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایم فل کا مقالہ لکھا۔ یہ اپنے موضوع پر بڑا اہم مقالہ تھا جس میں بڑے اہم ماخذ استعمال کیے گئے تھے۔ امید ہے کہ اب جب اطہر فاروقی نے اپنی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے تو وہ اس مقالے کو بھی شائع کرائیں گے۔ میں نے صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے دہلی یونی ورسٹی میں انھیں لیکچرشپ بھی آفر کی مگر ابتدا ہی سے ان کی دل چسپی درس و تدریس میں نہیں تھی بلکہ وہ اپنے لیے کمیونسٹ نظریات کی توسیع میں وسیع تر جولا نگاہیں تلاش کرنا چاہتے تھے اس لیے جواہر لال نہرو یونی ورسٹی چلے گئے اور بعد کے برسوں میں ان سے میرا رابطہ کم سے کم ہوتا گیا۔ پھر میں بھی کوئی پانچ برسوں کے لیے ہندوستان سے باہر چلا گیا یوں یہ رابطہ تقریباً منقطع سا ہو گیا۔ اب اس کتاب کے ذریعے اطہر فاروقی کی علمی سرگرمیوں کے ایک رخ سے بھرپور تعارف ہوا۔ وہ رخ یہ ہے کہ کس طرح عوامی ذرائع ابلاغ کا بھرپور استعمال وہ اپنے نظریات کی تبلیغ کے لیے کرتے رہے۔ اس کتاب میں جو انٹرویو شامل ہیں ان میں سے اکثر شائع تو غیر ترقی پسند اخبارات و رسائل میں ہوئے ہیں مگر سب کے سب مکمل طور پر ترقی پسند نظریات کے ترجمان ہیں۔ کمیونسٹ نظریات کی جلوہ گری اس کتاب کے ہر جملے میں ہے اور ظلمت پسند اور اساس

پرست قوتوں کی مذمت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا گیا ہے۔ اس کتاب میں بعض ایسے لوگوں کے انٹرویو بھی شامل ہیں جو نظریاتی طور پر ترقی پسند مخالف ہیں۔ ان لوگوں کو اطہر فاروقی نے بڑے سلیقے سے Expose کیا ہے۔ اطہر فاروقی کی نظریاتی شدت اور ہر حال میں غیر مفاہمت پرست اور rationalist رہنے کا معاملہ پرانا ہے۔ rationalist ہونے کے سبب ہی اطہر فاروقی کی تحریروں کی غیر معمولی پذیرائی ہر طبقے میں ہوئی۔

ان انٹرویوز میں اور اطہر فاروقی کی دوسری تحریروں میں بھی سب سے اہم موضوع زبان کی سیاست کا ہے۔ اطہر فاروقی نے اردو زبان کے نام پر کی جانے والی سیاست پر بڑا وقیع علمی کام کیا ہے۔ اردو تعلیم کی صورت حال پر انھوں نے پہلی بار ہندوستان بھر میں گھوم گھوم کر مستند اعداد وشمار جمع کیے۔ ان کے بعد بھی یہ کام کسی اور نے نہیں کیا۔ گویا اردو تعلیم کا جو بھی منظر نامہ آج ہمارے سامنے ہے اس کا علمی حصہ اطہر فاروقی ہی کا مرتب کیا ہوا ہے کیوں کہ پہلے ہمارے پاس اردو تعلیم کے اعداد وشمار اور مستند حقائق تھے ہی نہیں۔ بعد میں اطہر فاروقی نے اردو تعلیم کے مجموعی مسئلے کو ترقی پسند نظریاتی اساس فراہم کی۔ انھوں نے جو نقطۂ نظر پیش کیا، وہ زبان کے طور پر ہندوستان میں اردو کے فروغ کا موثر لائحۂ عمل ہوسکتا ہے۔ تقسیم ہند سے قبل اردو اور ہندی دونوں ہی زبانیں فرقہ وارانہ اور ظلمت پسندانہ سیاست کے ایجنڈے پر رہیں۔ تقسیم کے بعد اردو اگر ایک طرف فرقہ وارانہ ہندو قوتوں کی شقاوت اور اساس پرست مسلم قوتوں کے استحصال کا شکار ہوئی تو دوسری طرف تقسیم سے پیدا شدہ حالات میں ہندوستان کی قومی سیاست نے اردو کے تئیں جو مایوس کن رویہ اختیار کیا اس نے اردو کو مسلمانوں کی زبان بنا کر اسے دینی مدارس میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ گیارہ ستمبر کے حادثے کے بعد اب جب کہ دینی مدارس کا رول دنیا بھر میں نئے سوالات کھڑے کر رہا ہے، اردو ایک مرتبہ پھر ہندوستان کی ترقی پسند سیاست کے ایجنڈے میں جگہ چاہتی ہے۔ ہندوستان میں اردو کا احیا صرف عوام دوست سیکولر سیاست ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ اطہر فاروقی نے اردو کے مسئلے کی اس ہمہ جہتی کا اپنی تحریروں میں بڑا علمی تجزیہ کیا ہے۔ گیارہ ستمبر کے بعد مذہبی اداروں یعنی دینی مدارس کے سوال پر اور دینی مدارس میں اردو کے سوال پر جس بے باکی اور عالمانہ انداز میں اطہر فاروقی نے لکھا ہے، اس کی دوسری کوئی مثال نہیں۔ سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ ان کی علمی تحریروں کی پذیرائی ہوئی اور انھیں وقار حاصل ہوا۔

بدقسمتی سے ہندوستان میں اردو تعلیم کا موضوع اب تک اردو دانشوروں خصوصاً یونی ورسٹیوں میں برسر کار اساتذہ کی توجہ کا موضوع نہیں بن سکا ہے۔ یونی ورسٹیوں میں اردو اساتذہ کی اکثریت کی اردو تعلیم کے موضوع سے دلچسپی اردو ادب تک محدود ہے اور اس کی وجہ اردو کے ان اساتذہ کی سیاست سے عدم دلچسپی اور ترقی پسند سیاست کی فہم کا فقدان ہے۔ سیاست اور وہ بھی ترقی پسند سیاست کو پس منظر میں رکھے بغیر ادب کا مطالعہ زندگی کی تلخ حقیقتوں سے محض فرار کا راستہ ہے۔ مغرب کی علمی دنیا خصوصاً امریکی اور برطانوی دانش گاہوں میں اطہر فاروقی کے نقطۂ نگاہ کی پذیرائی ہوئی ہے۔ مغرب کی علمی دنیا میں اردو زبان کے موضوع پر ہی نہیں بلکہ مسلمانوں سے متعلق ان موضوعات پر بھی جن میں اردو کے حوالے سے بحث کی جاتی ہے، اطہر فاروقی ہی کا کام بنیادی مواد کی حیثیت رکھتا ہے۔ مغرب میں سماجی علوم کے اسکالروں میں بھی اس نوعیت کا کام کسی نے نہیں کیا۔ اطہر فاروقی کا ایک مقالہ Future Prospects of Urdu in India جو انگریزی کے مقتدر علمی ہفت روزہ Mainstream کے 1992 کے سالنامے میں شائع ہوا تھا، ہندوستان میں اردو زبان کے سوال پر پہلا اہم علمی مقالہ تھا جو اس درجہ محنت سے لکھا گیا تھا کہ آخرش آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو کے مسائل کے مطالعے کے لیے یہ مضمون ایک سلیبس کی حیثیت اختیار کر گیا۔ ممتاز برطانوی اسکالر رالف رسل نے 1995 میں ہندوستان میں اردو کی صورت حال پر ایک مقالہ لکھا جو پوری طرح اطہر فاروقی کے مختلف مضامین سے اتفاق واختلاف کے گرد گھومتا تھا۔ انگریزی کے موقر علمی رسائل میں شائع ہونے والے ڈاکٹر اطہر فاروقی کے متعدد اثر انگیز مضامین اردو زبان کی صورت حال اور مسلمانوں سے اردو کے رشتے کا تجزیہ کرتے ہوئے اردو کی تعلیم کے پیچیدہ مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اطہر فاروقی نے اس سلسلے میں صرف اتر پردیش ہی نہیں جہاں اردو جانکنی کے عالم میں ہے بلکہ دوسری ریاستوں میں بھی اردو کی صورت حال پر تفصیل سے لکھا ہے اور ان کی ہر تحریر ان کے ذریعے جمع کیے گئے اعداد وشمار پر مبنی ہوتی ہے۔

اردو زبان کو مکمل تباہی سے بچانے کے لیے اطہر فاروقی نے کئی طرح کی تجاویز پیش کی ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ یہ تجاویز عملی ہیں، خیالی یا مثالی نہیں جو اس سے پہلے اردو اشرافیہ کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ اطہر فاروقی کا یہ خیال صحیح ہے کہ آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمان اس خام خیالی کا شکار رہے کہ اردو ہندو اور مسلمانوں کی ایسی مشترکہ وراثت ہے جس کا تحفظ ہندو ضرور کریں گے۔ ہندی مسلمانوں کو یقین تھا کہ جمہوری آزادی کے ماحول میں حکومت اردو زبان کے تحفظ کے لیے موثر تدبیریں کرے گی لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔ تقسیم کے بعد ہندوستان کی سیاست جس راہ پر جانے کے لیے مجبور ہوئی، مسلمانوں نے اس کی منطق اور اثرات مابعد کو نظر انداز کر کے محض خوش گمانی کا رویہ اختیار کیا جس نے انھیں زندگی کے ہر شعبے میں پسماندہ ترین بنا دیا۔ انجمن

ترقی اردو (ہند) جیسا کل ہند ادارہ جس کے تحت 1952 میں اردو کے حقوق کی حفاظت کے لیے بیس لاکھ دستخط جمع ہوئے تھے وہ بھی آہستہ آہستہ اردو کے تحفظ کی ذمے داری سے اسی لیے دست بردار ہو گیا کیوں کہ اس کے موقع پرست رہنما برسر اقتدار سیاسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور تقسیم کے نتیجے میں خوف میں مبتلا ہو گئے تھے۔ سیکولرازم ان کے لیے ایک جمہوری قدر نہیں بلکہ Populist Approach تھی۔ مفاد پرستوں کی یہ وہی جماعت ہے جس نے فخر کے ساتھ اتر پردیش کو یک لسانی یعنی ہندی ریاست بنا دیا۔

اردو کے احیا کے لیے ڈاکٹر اطہر فاروقی کی تجویز یہ بھی ہے کہ اب صرف اردو عوام ہی اردو کو زندہ رکھنے کی مہم چلا سکتے ہیں۔ اطہر فاروقی کو اس کا بھی افسوس ہے کہ بائیں بازو کی سیاسی طاقتیں نظریاتی قوت کے ساتھ اردو کے احیا کی لڑائی میں شریک نہیں ہو سکیں۔ اس سلسلے میں وہ مدرسوں کی تعلیم کے نظام کو بھی ذمے دار ٹھہراتے ہیں۔

ملک کے موجودہ حالات میں ڈاکٹر اطہر فاروقی نے اردو کی تعلیم اور اس زبان کو ترقی پسندانہ خطوط پر زندہ رکھنے کے لیے جو اہم تجاویز اپنی علمی تحریروں اور معروضی تجزیے کے ذریعے پیش کی ہیں ان کے پیچھے تحقیق و تفتیش اور غور و فکر کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو والے ان تجاویز کو جو بہر حال ایک علمی کام کے طور پر سپرد قلم کی گئی تھیں، ایک موثر لائحۂ عمل بنا کر حریفوں کی چنوتیوں اور سازشوں کے گرداب سے اردو کو نکالنے کی سعی کے طور پر استعمال کریں۔

اس کتاب میں حالاں کہ موضوعات کا مرکز اردو ہی ہے مگر بین الاقوامی سیاست اور کلچر جیسے مسائل پر بھی انٹرویو اس میں شامل ہیں۔ نوبل انعام یافتہ دلائی لاما سے پہلا انٹرویو جس ہندوستانی صحافی نے لیا وہ اطہر فاروقی ہی تھے۔ اسی طرح بھارتیہ جنتا پارٹی کی رام مندر تحریک پر دلیپ کمار اور مرار جی ڈیسائی کے انٹرویو بھی اہم ہیں۔ مرار جی ڈیسائی کا انٹرویو تو خاصے کی چیز ہے جس میں کمال بے باکی سے ہندوستانی سیاست اور مسلمانوں سے متعلق بھی سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں۔ پاکستان کے سابق وزیر اعظم محمد خاں جونیجو کا انٹرویو اس امر کا غماز ہے کہ موجودہ جمہوری دور میں بھی پاکستان کی سیاست کس طرح عہد وسطیٰ کے طرز کے ان جابر حکمرانوں کے پنجوں میں ہے جنھیں جمہوری نظام میں اپنی رسوائی کا کوئی خوف نہیں۔ ادبی انٹرویوز میں خصوصاً اختر الایمان کا انٹرویو بے حد اہم اور حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کتاب میں ایک اہم انٹرویو علامہ اقبال کے صاحبزادے جسٹس جاوید اقبال کا ہے۔ یہ انٹرویو بہت طویل ہے اور اقبالیات کے بہت ہی اہم گوشوں سے ہمیں روشناس کراتا ہے۔ اس انٹرویو میں خصوصاً اسلام کی اجتہادی فکر اور دور جدید میں اس کی معنویت سے بحث کی گئی ہے۔ اس انٹرویو کا مطالعہ اقبالیات کے ہر طالب علم کو کرنا چاہیے خصوصاً ان متعلمین کو جو اقبال کی مشہور کتاب ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' Reconstruction of Religious Thought in Islam (جسے مدراس لیکچرس بھی کہا جاتا ہے) سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس انٹرویو میں مدارس لیکچرس پر تفصیل سے عام فہم زبان میں گفتگو کی گئی ہے جو بجائے خود اپنے آپ میں بے حد مشکل کام ہے۔ اقبال کی اصل کتاب انگریزی میں ہے اور اس کی زبان اس درجہ ادق ہے کہ اس کے ترجمے میں اولاً مترجم کو بیس برس لگ گئے۔ اطہر فاروقی کے سوالات اسلام کی مجتہدانہ فکر ہی نہیں بلکہ اقبال کی اس کتاب سے ان کی غیر معمولی واقفیت کا خوش گوار ثبوت بھی فراہم کرتے ہیں۔ مدراس لیکچرس پر عام فہم گفتگو کے لیے ہی اردو داں مسلم دنیا کو اطہر فاروقی کا حد درجہ شکر گزار ہونا چاہیے۔ مجھے پوری امید ہے کہ یہ انٹرویو اقبالیات میں ایک اہم اضافہ ہوگا۔

اپنے پیش لفظ میں اطہر فاروقی نے بہت صاف گوئی سے اردو صحافت کے معاصر منظر نامے پر گفتگو کی ہے۔ کتاب کے آخر میں ہمارے عہد کے مشہور طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کا خاکہ ''اطہر فاروقی: خوب صورت تضادوں کا آدمی'' شامل ہے۔ مجتبیٰ حسین نے یہ خاکہ نہ صرف بہت محنت سے لکھا ہے بلکہ ان کی تحریروں کے کسی بھی انتخاب میں یہ خاکہ سر فہرست ہوگا۔

اس کتاب میں جن لوگوں کے انٹرویوز شامل ہیں ان کے اسمائے گرامی اس طرح ہیں:

اختر الایمان، مجروح سلطانپوری، احمد فراز، شہریار، ظفر پیامی، شاہد حسن کمال، حمایت علی شاعر، بیکل اتساہی، رشید حسن خاں، شمس الرحمٰن فاروقی، محمد حسن، خلیق انجم، رالف رسل، نامور سنگھ، محمد علی صدیقی، قمر رئیس، عبد المغنی، جسٹس جاوید اقبال، امتیاز احمد، دلیپ کمار، محمد علی، میر خلیل الرحمٰن، مجیب شامی، معین اعجاز، مرار جی ڈیسائی، وی پی سنگھ، محمد خاں جونیجو، اقبال احمد خاں اور دلائی لاما۔

امید کہ انٹرویوز کے اس مجموعے کو جس میں موضوعات کے تنوع کے ساتھ مواد کا بحر بے کراں بھی موجود ہے، اہل نظر کی پذیرائی کا شرف حاصل ہوگا۔ بہت دنوں کے بعد اردو میں ایک ایسی کتاب شائع ہوئی ہے جو اہل علم اور اردو داں عوام میں یکساں دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی اس کا قابل مطالعہ ہونا ہے اور یہ وصف اب اردو کی بیش تر کتابوں میں مفقود ہوتا ہے۔

لفٹ (ناول)/نسترن احسن فتیحی

صفحات:180، قیمت:-/150 روپئے

ناشر: ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مبصر: فیروز عالم، کے۔110/اے، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔25

''لفٹ'' نسترن احسن فتیحی کا پہلا ناول ہے۔ جو ایک بے حد اہم موضوع پر لکھا گیا ہے۔ آج کے مسابقتی دور میں ہر آدمی چور دروازے کی تلاش میں ہے چنانچہ نوکری حاصل کرنی ہو یا کسی دفتر میں کوئی کام کرانا ہو، ہر جگہ اسی کو اختیار کیا جا رہا ہے۔ نتیجتاً مستحقین کی حق تلفی ہوتی ہے اور غیر مستحقین ان مقامات یا عہدوں تک رسائی کر لیتے ہیں جن کے وہ حقدار نہیں ہوتے۔ ناول میں ''لفٹ'' کو اسی شارٹ کٹ کے استعارے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ناول کے مرکزی کردار اجے ورما اور نیک رام کی یہ گفتگو اس کی مزید وضاحت کرتی ہے۔

''سر لفٹ کی سہولت ہوتے ہوئے آپ سیڑھیوں سے کیوں جاتے ہیں؟

.....نیک رام پہلی منزل کے لیے لفٹ کے بٹن پر انگلی رکھ کر ہنستا ہے۔

''کیا بات ہے نیک رام؟''

''کیا مزے کی چیز ہے سر..... انگلی کے ایک اشارے سے آپ اپنی منچاہی منزل پا سکتے ہیں تو اتنے ہاتھ پیر کیوں ہلائے جائیں؟''(ص 50)

زندگی میں شارٹ کٹ کا استعمال کر کے نیک رام مسلسل ترقی کرتا جاتا ہے۔ کلرک سے ہیڈ کلرک بن کر وہ جلد ہی دیگر جملہ سہولیات بھی حاصل کر لیتا ہے۔ اجے ورما پوچھتے ہیں۔

''اتنی جلدی کیسے مل گیا تمھیں کوارٹر۔ بڑی لمبی ویٹنگ لسٹ ہوتی ہے۔ نوکری کے کم از کم تین یا پانچ سال بعد ہی نمبر آتا ہے اور تمھیں تو چند مہینے ہی ہوئے ہیں جوائن کیے ہوئے؟''

''سب اوپر والے کی کرپا ہے صاحب..... آپ نے ٹکٹ لینے والوں کی بھیڑ کو ونڈ اسکرین پر بھی دیکھا ہے۔ کتنی لمبی لائن ہوتی ہے مگر اسی لائن میں ادھر ادھر سے گھس کر کچھ لوگ پہلے ٹکٹ لے جاتے ہیں اور لائن میں کھڑے لوگ اپنی باری کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔''(ص 95)

یہ ہمارے ملک کا المیہ ہے کہ با صلاحیت افراد در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور غیر مستحق لوگ اعلیٰ عہدوں اور منصبوں پر فائز ہو گئے ہیں۔

''لفٹ'' میں اجے ورما کا کردار جہاں ایمانداری اور اپنی صلاحیت کی بنیاد پر آگے بڑھنے والے افراد کی نمائندگی کرتا ہے وہیں نیک رام جو اپنی زندگی کے آخری مراحل میں یونیورسٹی کے اعلیٰ و ارفع عہدوں تک پہنچ جاتا ہے، رشوت اور جوڑ توڑ کے ذریعے ترقی کرنے والوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ چور دروازے سے آنے والے تیزی سے ترقی کر رہے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ با صلاحیت اور ایماندار افراد کے لیے تمام دروازے بند ہو گئے ہیں۔ راجیش اور سیما کے کردار اس کی عمدہ مثالیں ہیں جو اپنی محنت اور صلاحیت کی بنیاد پر اپنی منزل پانے میں کامیاب رہتے ہیں۔

یہ ناول ہمارے تعلیمی اداروں اور ملک کی سیاسی و سماجی صورت حال پر ایک بے لاگ اور بیباک تبصرہ ہے، علاوہ ازیں رشوت خوری، خوشامد پسندی اور غیر اخلاقی حرکات کی جانب بھی قاری کی توجہ مبذول کرتا ہے۔ ناول سے چند جملے ملاحظہ فرمائیں:

''پی ایچ ڈی کا وائیوا اس کے دل میں خوشی کے احساسات اجاگر نہیں کر پا رہا تھا کیوں کہ اس وائیوا کے بعد اس کی اسکالر شپ بند ہو جائے گی۔''(ص 7)

''یہاں پورے گھر میں بجلی کی وائرنگ تھی مگر لائٹ شاید ہی کبھی آتی...اور اگر کبھی آ بھی جاتی تو لالٹین کی روشنی سے بھی شرمندہ ہوتی رہتی۔''(ص 30)

''اب دیوالی میں مٹھائی لے جانے کا رواج ختم ہوتا جا رہا ہے....لوگ خوبصورت پیکنگ میں خوبصورت تحفہ دینا چاہتے ہیں تاکہ آپ ان کے تحفے کے احسان کے نیچے دب جائیں....''(ص 46)

''بچے یا تو اب پڑھتے ہیں یا ٹی وی دیکھتے ہیں۔ بھوک لگنے پر برگر، پیزا اور چپس کھاتے ہیں۔ باہر کھیلنا، گھروں میں تیار کھانا کھانا، سب دھیرے دھیرے سہل پسندی کی عادت میں ختم ہوتا جا رہا ہے۔ اب تو گھروں کے منڈپ میں رسمی رواج کے ساتھ شادیوں کا چلن بھی ختم ہو رہا ہے.....ابھی کل ہی تو پڑوس کے گھر میں شادی ہوئی ہے۔ سب لوگ صبح کار میں بیٹھ کر کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں یا میرج ہال (شادی گھر) میں چلے گئے۔ رات گئے بیٹی وداع کر کے واپس آ گئے۔ جس گھر میں چراغاں ہونا چاہیے تھا وہاں روز جلنے والا بلب بھی بجھا رہا۔''(ص 76)

''.....خوشامد اور ضمیر فروشی کی قیمت مارکیٹ میں چڑھتی جا رہی تھی اور حق پرستی اور راست بازی کی قیمت گرتی جا رہی تھی....حکومت سے تعلق رکھنے والے کمبل اوڑھ کر گھی پی رہے تھے... باقی اتنے بے تعلق تھے کہ آتی اور جاتی ہوئی حکومتوں کی آمد و رفت کے خاموش تماشائی بنے بیٹھے تھے۔''(ص 141)

یہ اقتباسات اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ سماجی اور عصری مسائل پر ناول نگار کی نگاہ کتنی گہری ہے اور بدلتی اقدار، ظلم و جبر، استحصال، اور غیر منصفانہ رویوں سے وہ کتنی نالاں اور اس کے مداوے کے لیے کتنی مضطرب و پریشان ہیں۔ نسترن احسن کا یہ ناول قاری کو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔

□□□

تحریر: بی. پی. گپتا

بچوں کا گوشہ

"بچوں کی کہانیاں" سے ماخوذ

ترجمہ: تسنیمہ زیدی

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے ساتھ ہی اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انھیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے بخوشی اس کا مطالعہ کریں۔ قومی اردو کونسل نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔

بچپن کو انسان کی زندگی کا بہترین حصہ کہا گیا ہے۔ بچپن کی یادیں ہمیشہ انسان کے ساتھ رہتی ہیں۔ "بچوں کی کہانیاں" میں ایسے ہی واقعات پر مبنی 17دلچسپ کہانیاں پیش کی گئی ہیں، جن میں بچوں کی بہادری، ان کی بھولی بھالی شرارتیں موضوع بنی ہیں۔ اس کتاب کی چند کہانیوں کے عنوانات یہ ہیں! "جہاز سے گر گیا"، "اور پاپا نے مجھے ڈانٹا"، "فاتحانہ مسکراہٹ"، "ہنس کے چور"، اپنے بالوں کی حفاظت میں"، "یادگار سفر"، "سالگرہ کی دعوت" وغیرہ۔قومی اردو کونسل کی شائع کردہ 113صفحات کی اس کتاب کی قیمت25 روپئے ہے۔قومی اردو کونسل اپنی کتابوں پر طلبہ اور اساتذہ کو چالیس فیصد خصوصی رعایت دیتی ہے۔

ترکی ٹوپی

بہت انتظار کے بعد آخر آدھی چھٹی کا گھنٹہ بج ہی گیا، ہم سب تیزی سے کلاس سے باہر بھاگے۔ میں نے بھی تھیلے میں سے گلی نکالی اور دوڑ پڑا۔ میرے پیچھے پیچھے خوشحال بھی ڈنڈا لے کر لپکا، پنّا، رگھوبیر، برج پال، پرکاش، کوشل، بشن، ختیانند اور باقی سارے لڑکے ایک ساتھ باہر کی طرف دوڑ رہے تھے۔ ہم سب اسکول سے باہر والے میدان میں پہنچے، ہم لوگ اکثر یہیں کھیلتے تھے۔

پرکاش نے زمین پر ایک بڑا سا دائرہ بنایا۔ خوشحال دائرے کے اندر کھڑا ہو گیا۔ آج کھیل شروع کرنے کی اس کی باری تھی۔ خوشحال نے دائرے کے بیچوں بیچ گلی جمائی اور بلا سنبھالا۔ باقی لڑکے دائرے کے چاروں طرف کچھ فاصلے سے کھڑے ہو گئے۔ سب کی نظریں خوشحال پر جمی تھیں۔ اس نے زور سے گلی کو مارا، گلی ہوا میں اڑتی ہوئی دور جا کر گری، ہم میں سے کوئی بھی اسے پکڑ نہ سکا۔

ختیانند دوڑ کر گلی کے پاس پہنچا اور اسے اٹھا کر اپنی پوری طاقت سے واپس اچھال دیا۔

خوشحال نے پھر ایک زوردار شاٹ لگایا اور گلی دوسری سمت اڑ گئی۔ اس طرف بشن کھڑا تھا، اس نے کیچ لینے کی پوری کوشش کی لیکن گلی اس کی انگلیوں سے پھسل گئی، بشن نے گلی اٹھائی اور پھر سے خوشحال کی طرف پھینکی۔ خوشحال نے اگلا شاٹ لگایا۔

خوشحال کے بعد میری باری آنی تھی لیکن اس کے بہترین شاٹ دیکھ کر مجھے لگا کہ میری باری آئے گی ہی نہیں، شاید مجھے کل تک انتظار کرنا پڑے گا۔ میں دعا کر رہا تھا کہ بس ایک بار خوشحال چوک جائے تاکہ مجھے کھیلنے کا موقع مل جائے لیکن وہ تو بہت اچھا کھلاڑی ثابت ہو رہا تھا۔

پنّا نے گلی خوشحال کی طرف اچھالی جو دائرے تک پہنچ بھی نہ سکی۔ خوشحال نے اب کی بار گلی برج پال کی طرف اچھالی۔ برج پال بھی کیچ نہ کر سکا، جب کہ یہ بہت آسان کیچ تھا۔ میں دل ہی دل میں برج پال کو برا بھلا کہہ رہا تھا۔ برج پال کو بھی افسوس ہو رہا تھا لیکن اب وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس نے جھلا کر گلی کو واپس پھینکا۔ اس بار بھی خوشحال آؤٹ نہ ہو سکا۔ اس بار گلی میری طرف آ رہی تھی میں کیچ لینے کے لیے بالکل تیار تھا۔ لیکن...... لیکن گلی مجھ تک پہنچی ہی نہیں!

اچانک کچھ شور سا مچنے لگا، کرتہ پاجامہ پہنے ایک صاحب میدان کے بیچوں بیچ کھڑے تھے۔ ان کی ترکی ٹوپی زمین پر الٹی پڑی تھی۔ غالباً گلی نے ان کی ٹوپی نیچے گرا دی تھی۔ لیکن سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ تھی کہ ٹوپی زمین پر

پڑی تھی اور گلی اس کے اندر تھی۔ وہ صاحب غصے سے بھبک رہے تھے۔

"بدتمیز لڑکو! دیکھو تم نے کیا کیا ہے؟" آج میں تمھیں اس کا مزہ چکھا کر ہی رہوں گا۔ وہ غصے میں چیخ رہے تھے۔

"معاف کیجیے صاحب، میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا تھا، بس اتفاق سے ہوگیا۔ میں بہت شرمندہ ہوں' خوشحال نے معافی مانگی۔

"کیا یہ تمھارے کھیل کا میدان ہے؟ تم لوگ اسکول کے میدان میں کیوں نہیں کھیلتے ہو؟" وہ غصے میں چلائے۔

برج پال آگے بڑھ کر تمیز سے بولا "جو کچھ ہوا ہمیں اس کے لیے شرمندگی ہے، ہمارے اسکول کا میدان بہت چھوٹا ہے۔"

"اسی لیے ہم کھیلنے کے لیے روز یہاں آتے ہیں' پَون نے بات پوری کی۔

"اور اس طرح کھیلتے ہو تم لوگ!" انھوں نے تیزی سے کہا۔

"میں تمھارے ہیڈ ماسٹر کے پاس جا رہا ہوں، وہی تمھیں بتائیں گے کہ کہاں کھیلنا چاہیے اور کیسے کھیلنا چاہیے۔"

خوشحال اور برج پال نے پھر خوشامد کی" جناب ہمیں معاف کر دیجیے ہم آئندہ پورا خیال رکھیں گے" مگر ان صاحب کا غصہ کسی طرح ٹھنڈا ہی نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید میں حالات سنبھال لوں گا۔ میں نے ٹوپی اٹھا کر ان کو واپس کرنی چاہی لیکن انھوں نے غصے میں میرے ہاتھ سے ٹوپی چھین لی اور میں گلی تک نہ نکال سکا۔ وہ تیزی سے مڑ کر اسکول کی طرف چل دیے۔

ہم سب ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ سارے راستے ہم ان سے معافی مانگتے رہے، لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ میں نے اپنے باقی ساتھیوں کی طرف دیکھا وہ سب اداس نظر آ رہے تھے۔ میں خود ہیڈ ماسٹر صاحب کے غصے سے خوف زدہ تھا۔

وہ صاحب اسکول میں داخل ہونے کے بعد سیدھے ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر کی طرف بڑھے اور چپراسی کے روکتے روکتے اسے دھکا دے کر سیدھے ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں گھس گئے۔ اندر سے تیز تیز آوازیں آ رہی تھیں۔ چپکے چپکے ہم ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے کے پیچھے والے حصے میں گئے اور کان لگا کر اندر کی باتیں سننے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم سب خاموشی سے دل ہی دل میں دعا کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد چپراسی ہم کو بلانے آ گیا۔ ہم ایک ایک کر کے ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے میں داخل ہوئے۔

"یہ کس کی حرکت تھی؟" انھوں نے کڑک دار آواز میں پوچھا۔

"کتنی بار میں نے تم سے کہا ہے کہ اسکول کے اندر کھیلا کرو۔"

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کسی میں بولنے کی ہمت نہیں تھی۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے پھر تیز آواز میں کہا" کیا تم سب گونگے ہو گئے ہو؟ بولتے کیوں نہیں؟"

میں نے ہمت کر کے کہا" سر ہم بہت شرمندہ ہیں، آئندہ ہم پورا خیال رکھیں گے۔"

"سب مل کر ان سے معافی مانگو!" ہیڈ ماسٹر صاحب نے کچھ نرمی سے کہا۔

"ہم تو بار بار معافی مانگ رہے ہیں سر!" برج پال نے کہا۔

"تم لوگ میرے سامنے معافی مانگو" ہیڈ ماسٹر صاحب نے زور دے کر کہا۔

"ہمیں معاف کر دیجیے جناب" ہم سب نے ایک ساتھ کہا۔

"ٹھیک ہے!" یہ کہہ کر وہ صاحب ہیڈ ماسٹر صاحب سے مخاطب ہوئے "شکریہ جناب" اب وہ مطمئن نظر آ رہے تھے وہ دھیرے سے دروازے کی طرف بڑھے۔ مگر جیسے ہی ہم سب ان کے پیچھے پیچھے واپس جانے کے لیے مڑے پیچھے سے ہیڈ ماسٹر صاحب کی آواز آئی..... "رکو!"

"مگر یہ شاٹ لگایا کس نے تھا؟" انھوں نے ذرا دیر رک کر پوچھا۔

میں نے خوش حال کی طرف دیکھا وہ بھی میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں گھبرا گیا، دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

لیکن الزام میں اپنے دوست پر بھی تو نہیں لگا سکتا تھا۔ میرا دل بیٹھ جا رہا تھا۔ میں نے الزام اپنے اوپر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ جھلکنے لگی اور مجھے یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ یہ سوال سزا دینے کے لیے نہیں پوچھا گیا ہے۔ کچھ کہنے کے لیے میں نے منہ کھولا ہی تھا کہ خوشحال نے جلدی سے جواب دیا۔

"جناب، یہ میرا شاٹ تھا۔ مگر میں اس کے لیے بہت شرمندہ ہوں۔"

"واہ کیا شاٹ تھا" ہیڈ ماسٹر صاحب نے خوش ہو کر کہا۔ "تم نے گلی اچھالی، کسی شخص کی ٹوپی کو نشانہ بنایا، ٹوپی کو نیچے گرایا اور پھر گلی ٹھیک ٹوپی کے اندر بھی پہنچ گئی۔ بھئی مان گئے، تم تو سچ مچ بڑے استاد کھلاڑی نکلے۔"

اس وقت میری بڑی عجیب حالت تھی، ہنسی روکنا ناممکن تھا۔ لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب کی موجودگی میں زور سے ہنس بھی نہیں سکتا تھا۔ پھر بھی میں اپنی مسکراہٹ روک نہ سکا۔ مڑ کر چاروں طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ باقی سب بھی اپنی ہنسی روکنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ ہم سب باہر نکل کر جی کھول کر ہنسنے کے لیے بے چین تھے۔ ترکی ٹوپی والے صاحب نے مڑ کر دیکھا۔ لگ رہا تھا کہ انھیں بھی مزہ آ رہا تھا وہ مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے۔ ہماری ٹولی باہر نکلی اور پھر قہقہوں کا ایک طوفان سا آ گیا۔

□□□

گذشتہ دنوں قومی اردو کونسل کی جانب سے توحید انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، کٹیہار میں چلائے جانے والے کمپیوٹر سینٹر میں ایک سالہ کمپیوٹر ایپلیکیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی.ٹی.پی. کورس کے فارغین کے لیے جلسۂ تقسیم اسناد منعقد ہوا۔ اس موقعے پر لی گئی ایک یادگار تصویر۔

قومی اردو کونسل کی طرف سے مرکز ادب وسائنس، رانچی کے زیر اہتمام چلائے جارہے کمپیوٹر سینٹر میں 12 اپریل 2008 کو جلسۂ تقسیم اسناد منعقد ہوا۔ اس موقعے پر لی گئی تصویر میں ڈاکٹر نرمل منج، جناب این. اے. صدیقی، جناب سبودھ کانت سہائے وزیر مملکت حکومت ہند، پروفیسر احمد سجاد اور جناب طارق سجاد۔

[illegible]
Date of Publication 24/05/2006

URDU DUNIYA Monthly, June 2006, Vol. 8, Issue: 6
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H R D , Government of India

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

مصنف: شمس الرحمن فاروقی

جناب شمس الرحمن فاروقی کے خیال انگیز مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1973 اور دوسری بار 1998 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل مضامین نے تفہیم شعر و ادب کی نئی راہیں کھولیں۔ یہ اس اہم کتاب کا تیسرا ایڈیشن ہے جس میں پس نوشت آج یہ کتاب کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ بھی کردیا گیا ہے۔ جدید ادب اور جدید تنقید کی تفہیم نیز کلاسیکی ادب کی فہم و بازیافت دونوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

ڈیمائی سائز، صفحات۔528، قیمت-/228روپے

تصحیح: نثار احمد فاروقی

غلام ہمدانی مصحفی کا وطن امروہہ تھا لیکن ان کی عمر کا بیشتر حصہ دلی اور لکھنؤ میں گزرا اور ان دونوں بڑے ادبی مراکز سے کسب فیض کرکے انھوں نے ایک نیا رنگ سخن ایجاد کیا جو ان کی پہچان بنا۔ مصحفی بڑے پرگو شاعر تھے۔ جناب نثار احمد فاروقی نے جو مصحفی کے ہم وطن بھی تھے ان کی کلیات آٹھ جلدوں میں مرتب کردیا ہے جس میں سے چار شائع ہوچکے ہیں۔

جلد اول۔ صفحات 495 قیمت/-220 جلد دوم۔ صفحات 369 قیمت/-154
جلد سوم۔ صفحات 320 قیمت/-181 جلد چہارم صفحات 389 قیمت/-216

مصنف: ڈپٹی نذیر احمد

توبۃ النصوح اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کا تیسرا ناول ہے جو پہلی بار 1877 میں شائع ہوا۔ اصلاح معاشرہ کے مقصد سے لکھے گئے اس ناول کو کلاسک کا درجہ حاصل ہے اور یہ ملک کی تمام یونیورسیٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہے۔ ناول کا یہ ایڈیشن اترپردیش اردو اکادمی کے 1983 میں شائع کردہ نسخے پر مبنی ہے۔

صفحات۔175، قیمت۔-/75روپے

مصنف: ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد نے اس ناول میں انگریزی تہذیب کی اندھی تقلید اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کو موضوع بنایا ہے۔ ابن الوقت، نوبل صاحب اور حجۃ الاسلام کے کرداروں کی مدد سے ناول نگار نے انیسویں صدی کے ہندوستانی مسلم معاشرے کی عکاسی کی ہے جو اس عہد کی دور سے گزر رہا تھا۔ ناول کا متن اترپردیش اردو اکادمی کے 1973 میں شائع کردہ متن پر مبنی ہے۔

صفحات۔225، قیمت -/91روپے

مصنف: الطاف حسین حالی

مولانا الطاف حسین حالی صرف ایک عظیم شاعر اور نقاد تھے بلکہ انھوں نے سوانح نگاری میں بھی ایک اہم کارنامہ انجام دیا۔ حیات سعدی، یادگار غالب اور حیات جاوید جیسی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ حیات جاوید میں حالی نے سرسید کی زندگی کے حالات، افکار اور خیالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت یوں بھی ہے کہ حالی سرسید سے بہت قریب تھے اور سرسید نے ملک و قوم کی جو خدمت کی اس کے عینی شاہد۔

پانچواں ایڈیشن، صفحات۔907، قیمت:-/181روپے

ترتیب و تدوین مسعود الحق

چودھری محمد علی ردولوی اپنے زمانے کے ایک روشن خیال اور شگفتہ نگار ادیب تھے۔ ان کا تعلق بیسویں صدی کے ادیبوں کی اس نسل سے تھا جس میں ولایت علی بمبوق، سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ شامل تھے۔ ان کلیات میں ان کی تمام تحریریں جمع کردی گئی ہیں۔

جلد اوّل، صفحات 344 قیمت-/172 روپے
جلد دوم، صفحات 465 قیمت-/172 روپے
جلد اوّل، صفحات 460، قیمت-/172 روپے

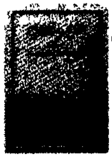

1921 سے 1946 کے درمیان کانگریس کے 17 اہم جلسے ہوئے جن کی صدارت حکیم اجمل خاں، سی آر داس، محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مہاتما گاندھی، سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس جیسے قائدین نے کی۔ اس کتاب میں آزادی سے قبل کانگریس کے جلسوں میں پیش کیے گئے تمام صدارتی خطبے جمع کردیے گئے ہیں۔

صفحات:580، قیمت-/280روپے

مصنف چارلس ڈکنس
مترجم: فضل حسین

انگریزی کے عظیم ناول نگار چارلس ڈکنس کے ناول ڈیوڈ کاپر فیلڈ کو عالمی کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔ اردو میں پہلی بار اس کا ترجمہ شائع کرنے کا شرف کونسل کو حاصل ہے۔ مترجم نے بہت سادہ اور عام فہم زبان میں اس ناول کو اردو کا قالب عطا کیا ہے۔

صفحات:516، قیمت:-/258روپے

نوٹ۔ طلبہ اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا

Printed and Published by Dr R K Bhat, Principal Publication Officer, NCPUL on behalf of NCPUL,
Printed at S Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published from
NCPUL, West Block-1, Wing-6, R K Puram, New Delhi-110066, Editor Dr R K Bhat, Tel 26103381 26103938